سب چلتا ہے

(اصلاحی تحریریں)

سید غلام حیدر شاہ قلندری

انجمن غلامانِ قلندر ویلفیئر سندھ، پاکستان

جُملہ حقوق محفوظ ہیں

نامِ کتاب:	سب چلتا ہے
مصنف:	سید غلام حیدر شاہ قلندری
معاون کار:	الطاف ملکانی
مرتب کنندہ:	شیر خان پنہور
اشاعت اول:	جون 2024
شائع کنندہ:	انجمن غلامانِ قلندر (ویلفیئر) سندھ۔ پاکستان ۔انفارمیشن شعبہ
تعداد:	1000
قیمت:	500

SUB CHALTA HAI

1ST EDITION: © JUNE 2024

PUBLISHED BY: A.G.Q.W SINDH PAKISTAN INFORMATION DEPARTMENT.

COMPOSING: Sher Khan Panhwar

Contact: 0300-3483688, 0313-3738040

Email: sherkhan.itian@gmail.com

فہرست

سیریل نمبر	تحریر	پیج نمبر	سیریل نمبر	تحریر	پیج نمبر
1	پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی خوشبو جیسی باتیں	5	17	ہدہد اور طوطا	27
2	اِظہارِ عقیدت	6	18	کرشماتی کردار	28
3	مصنف کی جانب سے پیش لفظ	9	19	آج کا ہائبرڈ انسان	29
4	تاریک راتیں، روشنی کی تلاش میں	10	20	لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی	31
5	چاندنی کا انتظار	12	21	جعلسازوں سے ہوشیار !	32
6	موسمی اور غیر موسمی چیزیں	14	22	بلی بلی میں فرق ہے	33
7	نام بڑا شہر ویران	15	23	حسد، جلن اور بد ہضمی	35
8	لاکھوں کے ہیرے، ٹکوں میں بکیں	16	24	برتن میں کچھ ہوگا تو نکلے گا	37
9	بندر کو بندر نہ کہیں تو کیا کہیں؟	18	25	دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا	39
10	وحشی پن	19	26	تماشے پہ تماشا	41
11	ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور	20	27	پکا مٹکا محبت کا	42
12	ہیرا پھیری میں بھی ہیرا پھیری	22	28	ظاہریت کی نمائش	44
13	اوجھڑی کبھی گوشت نہیں بنتی	23	29	جہادِ زندگی	45
14	چلتے ہیں کچھ لوگ ہوا کے ساتھ	24	30	مقامِ عشق	46
15	لائبریریاں اور لاپرواہیاں	25	31	حقیقتِ زندگی	47

16	فلسفہء نفس	49	32	فتنہ فساد کا گورکھ دھندہ	90
33	فطرتِ انسان	50	55	فلسفہ اخلاقیات	92
34	معاشرتی سبیلیں	52	56	کلاچی سے کراچی	94
35	تفسیرِ عشق	53	57	ہجوم یکسانیت وقوف عرفہ	96
36	تقاضاءِ وقت اور قحطِ محبت	54	58	عزتیں پامال مت کریں	98
37	نیا سال اور کھاد کا جہاد	55	59	تنگ دستی کے تاریک جال	100
38	کتے اپنے ہی گھر کے دشمن	57	60	نوازشوں کا نیلام	101
39	عقل اور علم کے جھگڑے	59	61	تقدس والی سرزمین	103
40	بجھانا سیکھو جلانا چھوڑو	60	62	سلو پوائزن	105
41	جیتنا ہے تو ہارنا بھی سیکھو	62	63	زندگی ایک تماشہ	107
42	چھٹکارا یا جھاڑو	63	64	بغیر پانی کے غسل خانہ	109
43	معاشرے کی گندگیاں	64	65	اعتدال ہی بہتر ہے	110
44	توقعات	66	66	قحطِ محبت	111
45	شواہد شناسائی	68	67	ڈار اور ڈالر	113
46	پسِ پردہ	70	68	ہمارے جھوٹے رسم و رواج	115
47	سفرِ مقصد	73	69	روایتی نیا سال	116
48	فطرت سے کھلواڑ	76	70	حرص والے ہارتے ہیں	118
49	وقت کی ستم ظریفی	78	71	توانائی کا تاوان	120
50	معاشرتی اندھیرا	80	72	سفر میں ہی تو منزل ہے	122
51	رکاوٹوں کی یہ بستیاں	82	73	دنیادار انسان کی داستان صوفیت کی آنکھ سے	124
52	سیاست سے بھی سیاست	84	74	ایک شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے	126
53	عورت کھلونا نہیں ہے	86	75	کتابوں کی فہرست	128
54	قانون کا منہ کھلا ہی اچھا لگتا ہے	88			

پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی خوشبو جیسی باتیں۔

آج جب ہم اپنے معاشرے پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف محبت، انسانیت، خود شناسی، خدا شناسی، امن اور سکون کا فقدان ہے۔ انسانیت اور اعلیٰ اخلاقیات کے تمام پھول تو جیسے پت جھڑ کے موسم کے حوالے ہو چکے ہیں۔ ہر انسان ظلم، بربریت اور گناہوں کی تیز دھوپ میں جل اور بُھن رہا ہے۔ کہیں بھی خوشبودار پھول اور سایہ دار درخت نہیں ملتے۔ بس لوگ ملتے ہیں تو کانٹے دار جھاڑیوں اور درختوں کی طرح۔ جس کے پاس بھی بیٹھو، جس سے بھی بات کرو، آپ کا دامن درد سے بھر جائے گا۔ زخم تو چاک ہی ہو جائیں۔ ہمارے معاشرے میں اصول اور اخلاق کا دامن تار تار ہو رہا ہے۔ پت جھڑ جیسے اس اداس اور ویران معاشرے میں، قبلہ سائیں سید غلام حیدر شاہ کاظمی قلندری کا وجود مسعود بہار میں کھلتے شگوفوں والے سایہ دار درخت جیسا ہے۔ سائیں بادشاہ کے قلم سے لفظوں کے جھڑتے پھول اور خوبصورت جملوں کے موتی دردمند دلوں کے لیے مرہم اور چاک گریباں کے لیے سوئی دھاگے کا کام کرتے ہیں۔ آپ کبھی مزاحیہ جملوں کے ذریعے اصلاح کرتے ہیں تو کبھی خوفِ خدا اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور کثرتِ درود پاک کی سنجیدہ باتوں سے محبت، انسانیت، اخلاق، حق اور سچ کی راہ پر چلنے کا درس دیتے ہیں۔ یہ ہم سب کی خوش بختی اور خوش نصیبی ہے کہ آپ ہمارے رہبر، مرشد اور رہنما ہیں۔

الطاف ملکانی۔

اظہارِ عقیدت

خدا غنی ست، اگر حمد کائنات کنند،
نبی غنی ست، اگر نعت شش جہات کنند۔
محمد ست بہ تحمید کبریا کافی،
خدای برتر در نعت مصطفیٰ کافی۔

'سب چلتا ہے' (اصلاحی تحریریں) کی اشاعت پر اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ ہمہ پہلو شخصیت (جناب سید غلام حیدر شاہ قلندری) اور اس شخصیت سے وابستہ افکار و تصورات میں دینِ خدا کے راستے پر جم کر ٹھرنا اپنی انفرادیت کا حامل موضوع ہے۔ متعدد صاحبِ علم و قلم نے اس موضوع پر منفرد انداز میں اپنی تحریریں قلمبند کی ہیں، لیکن یہہ موضوع اِس قدر سنجیدہ اور ہمہ گیر ہے، کہ اس پر جتنا لکھا جائے، کم ہے۔

ہر دور میں بندگانِ خدا نے اصلاحیں تحریروں کے توسط سے اِنسان ذات کو راہِ راست پر گامزن رہنے کی تلقین کی، اُسی طرح سائیں قلندری صاحب نے بھی اپنی شاہکار تحریروں میں خدا کی راہ پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ دلوں کو ماسوائے اللہ سے پاک رکھنا اور محبوبِ حقیقی کے سوا کسی کو اپنے دلوں میں بسنے نہ دینے کا راستہ دکھایا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ، "خداوند عالم فرماتے ہیں کہ میں نہ اپنے آسمانوں میں سما سکتا ہوں، نہ اپنی زمین میں سما سکتا ہوں، لیکن اپنے بندہ مومن کے قلب میں سما سکتا ہوں"۔

بندہ مومن کی اس وسعت کو سائیں قلندری صاحب نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تحریریں تزکیہ نفس، اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن سے سرشار ہیں۔ بندہ خدا نفس کی آفتوں اور بُرائیوں سے صاف ہو اور راہِ راست پر چلے تو اُس کا دل بجز اللہ پاک کے اور کسی چیز سے آرام نہ پائے گا۔

واضح رہے کہ ایک علم ظاہری سے اور دوسرا باطنی، یعنی صفاتی اور ذاتی۔ اس لیے کہ ہر ظاہر کو باطن لازمی ہے، جس طرح پوست کو مغز۔ علم ظاہر یعنی صفات متعلق ہے، ان نقوش مقررہ سے جن کو حروفِ ابجد کہتے ہیں۔ یہ مثال پوست کی ہے اور علم باطن، جس کا تعلق سینے سے ہے۔ بمصداق آیہ شریف:

"افمن شرح اللہ صدرہ"

اگر درویش بر یک حال ماندے،
سر دست از دو عالم بر فشادے۔

راہِ حق کا اَصل مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے باطن میں اخلاق حمیدہ پیدا کرے، جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ مثلاً صبر، شکر، تقویٰ، اخلاص اور رضائے الٰہی۔ اور برے اخلاق، جیسے تکبر، غضب، حرص، حسد اور ریاکاری سے خود کو بچائے۔ اسی طرح ہی انسان ذکراذکار اور تصورات کے ذریعے خداوند عالم کی معرفت، قرب، مشاہدے اور وصال کی لازوال دولت سے مالامال ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان ایک غیبی باطنی لڑائی اور روحانی جنگ بھی جاری ہے، جس میں ہم سائیں غلام حیدر جیسے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اور دین محمدی کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر فتح یاب ہو سکتے ہیں۔ مولانا رومی نے کیا خوب فرمایا ہے،

آں چہ بہ تبریز یافت یک نظر از شمس دین،
طعنہ زند بردہ و سخرہ کند بر چلہ۔

حقیقت میں ہم لوگوں کو اپنے قلب کو انوارِ ہدایت سے منور کرنے اور ضلالت اور گمراہی سے دور ہونے کی کوشش ہردم کرنی چاہیئے۔ "یہدی اللہ لنورہ من یشاءُ "آیہ مبارکہ کے مطابق جب ہم عشقِ حقیقی میں ڈوب جاتے ہیں، تب دل میں دُنیا سے دوری اور آخرت کی رغبت پیدا ہونے لگتی ہے اور پھر عجز و انکساری سے اپنے عصیان میں معافی

طلب کرتے رہتے ہیں اور اکثر اوقات عباداتِ خدا میں مصروف رہنے لگتے ہیں، شریعت و طریقت کی غلامی میں فخر اور شیطانی وساوس و ہوائے نفسانی سے خود کو محفوظ رکھنا عین عبادت ہے۔ اسی طرح ایک نیک بندہ خدا اپنے امراض باطنی کیلئے حکیم صادق سے رجوع کرنے میں مشغول ہوتا ہے، جس کے بعد اوصافِ حمیدہ، علم، حلم، سخاوت، انکساری، خاکساری، تحقیر نفس، کم خوری، کم آرام طلبی اور کم گفتگو کی عادت ہونے لگتی ہے اور یہ ہی ایک سچے سالک کی پہچان ہے۔

سالک ہر وقت توبہ و استغفار (سوائے خدا کوئی مطلب نہیں)، دنیا و ما فیہا سے لا تعلق، توکل، ترکِ خواہشات نفسانی و شہوانی، لوگوں سے کنارہ کشی، یادِ خدا، صبر، رضائے الٰہی، ذکر خدا اور فنافی اللہ میں مشغول رہتا ہے اور یہی خوبیاں بندے اور خدائے دوجہاں کے درمیان روابط پیدا کرنے میں موثر ہوتی ہیں۔ مطلب عمل کے بغیر علم کسی کام کا نہیں۔ جیسا حکیم لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا، "اے میرے لختِ جگر! جس طرح کھیت پانی اور مٹے کے بغیر درست نہیں ہوتا، اُسی طرح ایمان بغیر علم و عمل کے قائم نہیں رہتا۔"

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی،
یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے، نہ ناری ہے۔

میرزا صفدر حسین 'سیفی'
حیدرآباد - سندھ

مصنف کی جانب سے پیش لفظ

رب جلیل کے نام سے منسوب ہماری ساری دعائیں اور تحریں، اصلاحی کالم نویسی کے مضامین، ان کے ساتھ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل پر قائماً دائماً درود سلام، تمام احباب ذوقِ جنونِ ادب اور اشاعت علم و قلم کے سامنے انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ سلامِ مخلصانہ !

اصل میں یہ تصنیف "سب چلتا ہے" اخبارات میں شایع ہونے والے کالموں کا مجموعہ ہیں جس کا مقصد اصلاح معاشرہ ہے۔ بس اِس ناچیز کی ایک چھوٹی سی کاوش ہے۔ جس کو بیٹے شیر خان پنہور اور اس کے رفقاء اور الطاف ملکانی جیسے ماہرِ ادب و قلم کے تعاون اور دن رات کی محنت نے یہ شکل دی ہے۔ اخبارات میں شایع شدہ یہ کالم اکٹھے ہوکے آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ یاد رہے کہ دل سے پڑھ کر ہی تحریر کے اسرار کا پتا چلتا ہے۔

یہ کتاب ان تمام اخبارات کے ایڈیٹر وں کے نام کرتا ہوں جن کے اخبارات میں یہ کالم، شیر خان پنہور اور ریاض عالمانی کی توسط سے وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں۔

آپ سب کا شکریہ، خاص کر کمنٹس لکھنے والوں کا، جن سے میرا اور میرے دوستوں کا حوصلہ بلند ہوا ہے۔

سید غلام حیدر شاہ قلندری۔

تاریک راتیں، روشنی کی تلاش میں

روشنی اور اندھیرے کا آپس میں ہمیشہ ایسے ہی ساتھ چلتا آرہا ہے جیسے سچ اور جھوٹ کا، حق اور ظلم کا، سردی اور گرمی کا، جیسے ہٹ دھرمی اور صبر کا، انائیت اور عاجزی کا، خیر اور شر کا۔ یہ دو طرفہ تضادات چلتے ہی رہتے ہیں۔ جیسے دن اور رات، ساتھ ساتھ ہیں ویسے ہی نیک اور بد بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسے ہی زندگی کے یہ تضاد سارے دکھوں سکھوں میں یہ ایک دوسرے کے ساتھ منزل بہ منزل چلتے رہتے ہیں.

جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو، کچھ نظر نہ آئے، وہاں کچھ تلاش کرنے کے لیے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے پھر وہ آسانی سے ملے یا مشکل سے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انسان نے چراغ بنائے، اس میں بتی لگا کر کسی بھی تیل کے ذریعے روشنی کرنا شروع کی۔ جیسے جیسے روشنی تیز ہوتی گئی تو کچھ نہ ملنے والی نایاب چیزیں بھی ملتی گئیں۔ کام آسان ہوتے گئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ شمعدان سے لے کر برقی لائیٹ وغیرہ ایجاد ہوتی آئیں۔

مگر افسوس کہ آج سب سے بڑا اندھیرا انسان کی سوچ اور ذہن کا ہے، اس کو یا تو علم روشن کرے گا یا کوئی ایسی فراست اور فہم جو ذہن اور سوچ کو اندھیرے سے روشنی کی طرف لائے۔ وقتی فائدے کے لیے خدا نے علم عقل اور دانائی دے کر انسان کو اس قابل ضرور بنایا کہ اس نے سوچنا شروع کیا۔ روز بروز نئ چیزیں روشن کیں، مگر وہ سوچ کے اندھیرے کو بالکل ختم نہیں کر سکا۔ اس لیے خود غرضی، ضد اور انائیت کے برعکس صبر، استقامت اور اپنا پن جیسی خوبیاں اب بھی تلاش کرنا ضروری ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کچھ کاپی پیسٹ کرنے والے مقرر اور دانا تو پیدا ہوئے مگر تاریکی کو دور کرنے والے تخلیق کار کم سامنے آئے یا پھر اس سماج نے انکو قبول نہیں کیا۔ کوئی شک نہیں کہ خیر کو شر کی جگہ لینے کے لیے وقت چاہیے۔ اتنی آسانی سے شر اپنی جگہ کیسے چھوڑے گا؟ جس نے ہمیشہ کرسی کے سہارے رعب و دبدبہ استعمال کیا ہو وہ بھلا سیاہ سے سفید کیوں ہو؟ کم علم مائیک

پکڑنے والا شوقین بیچارہ رٹا لگا کر دو تین جملے تو بول لے گا لیکن درست مفہوم اور حقیقت کی خبر اسے خدا ہی دے۔

درویش کے پاس آج یہ بحث ہو رہی تھی کہ آج چاندنی عروج پر ہے، یعنی آسمان پر پورا چاند نکلا ہے۔ اس روشنی میں بھی کئی چوریاں ہونگی۔ ایک چور جھوٹ لے کر نکلے گا سچ کو تلاش کرنے کے لیے. ایک نقل کرنے والا نکلے گا اصل کی تلاش میں۔ کچھ لوگ دلوں کی فوٹو کاپیاں نکال کر ان کو دینے نکلیں گے جن کے پاس پہلے ہی ایسی کاپیوں کے بنڈل پڑے ہونگے۔ باقی چاندنی اپنا کام نبھائے گی۔ ٹائم پورا کرے گی۔ کسی کو کیا ملا اور کیا ملے گا فیصلہ پھر سے وقت پر ہوگا۔ گفتگو میں موجود پہیلیاں سمجھنے میں مشکل ہو رہی تھی تو درویش نے پھر سے بولنا شروع کیا

"دیکھیں انسان کے لیئے روشنی کتنی ضروری ہے؟ جب تک ذہن روشن خیال اور دل روشن ضمیر نہ بنیں گے تو یہ الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ پھر اس تاریک سماج کی تاریکیاں ختم کیسے ہونگی؟ جہاں سچ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ کتا اور بلی سب کچھ حلال۔ ہر کوئی ایسے ہی کہہ رہا ہے کہ چاند بھلے ڈھل جائے مصنوعی روشنی جلائی جائے گی۔ جو ہمیشہ سے مصنوعیت کے عادی ہیں ان کو اصلیت کی ضرورت کیوں پڑے گی؟ وہ سب کچھ چھوڑ چکے انکو وقت کے ضیاع کا غم بھی کیوں ہو؟ ان کو کیا پتا کہ روغن گلاب سے جلنے والے چراغ کی مہک اور مٹی کے تیل پر جلنے والے دیے کی دھوئیں والی بدبو برابر نہیں ہو سکتے۔ وقت تو گزر ہی جاتا ہے مگر ذہن کی تاریکی کو فقط سچ کی چاندنی ہی دور کر سکتی ہے۔

لیکن یاد رہے کہ چاندنی کے آنے کے لیے انتیس دن اندھیرا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذہن بدلنے میں بھی وقت لگے گا۔ صبر کے ساتھ انتظار کیا جائے گا تب جا کر محبت اور سچ سے متنفر اس وادی میں سیاہ جھوٹ پر سفیدی غالب آئے گی"۔

روزنامہ "انکوائری" بدھ 28 ستمبر 2022۔

روزنامہ "پاسبان" بدھ 28 ستمبر 2022۔

چاندنی کا انتظار

چاند اور چاندنی کا موضوع ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے۔ چاند جہاں روشنی کا سبب ہے وہیں مذاہب کی کتب میں بھی اس کا ذکر آیا ہے، جیسے قرآن پاک میں شمس و قمر کا ذکر ملتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شق القمر والا معجزہ بھی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شاعروں نے اپنی شاعری میں اپنے محبوب کے چہرے کو چاند سے تشبیہ دی ہے، جس سے وقت کے مجازی مستانے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ سہنی اور میہار کے قصے کو بھی اندھیرے اور چاندنی راتوں کے عنوان سے سندھ کے صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمت اللہ علیہ نے اپنے اشعار میں اس لازوال محبت کی داستان کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

حقیقت میں بھی چاند جب محبوب کے حسین چہرے کی طرح کالے بادلوں میں چھپن چھپائی شروع کرتا ہے، تو عاشقانہ دلوں میں ایک عجیب ہلچل اور رم جھم جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کئی مستانے فطری فکروں کے فاصلے طے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے عجیب بات ہے۔ زیادہ روشن تو سورج ہے، لیکن چاندنی کے حسن کا ذکر زیادہ کیا جاتا ہے۔ چاندنی رات میں دلبر اور دلرُبا کی ملاقاتوں اور ایک دوسرے کو ڈھونڈنے کی بے شمار کہانیاں ہیں۔ پرانے زمانے میں ہمارے گاؤں کے نوجوانوں کے دری (سندھ میں ایک قسم کا کھیل) اور کبڈی کے کھیل چاند کی چاندنی میں ہوتے تھے۔ چاندنی راتوں کو عورتیں پڑوس کے مزار پر حاضری کے بہانے گھر سے باہر نکلنے کا موقع پا لیتی تھیں۔ چاندنی مجاز سے بھری ہوئی روشنی ہے۔ اگر اسے گرہن لگتا ہے تو عاشق کا دل ایسے تڑپتا ہے جیسے دیدار کا دلاسہ جدائی میں تبدیل ہو گیا ہو۔ چاند پر موجود بڑھیا کی کہانی بھی بہت پرانی ہے۔ سائنسی

بنیادوں پر فلکیاتی نظریات اور نجومیوں کی منطق الگ الگ ہیں۔ بہر حال چاند کے ساتھ ایک حسین تصور ہمیشہ سے وابستہ رہا ہے۔

لیکن آجکل اس فطری حسن کو توسائنسدانوں نے پاؤں تلے روند دیا ہے۔ ایک خلائی راکٹ چاند پر اترتا ہے تو دوسرا راستے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح چاند پر قبضہ مافیا رسہ کشی میں مشغول ہیں۔ اور سنا ہے اب چاند پر Wi-Fi بھی چلے گی۔ ٹوٹی ہوئی اور جدا ہوتی ہوئی آوارہ روحیں جو چاند کو ایک محبوب سمجھ کر رونے اور منانے میں لگ جاتی تھیں کیا اب وہ کسی بیوٹی پارلر کے سامنے محبوب کا انتظار کریں گی ؟ (کہ کب تیار ہو کر باہر نکلے تو دیدار ہو) عین اسی طرح جیسے منافع خور مافیا بجٹ کے انتظار میں ہوتی ہے کہ کونسی اشیاء مہنگی ہونگی۔ یا جیسے نوجوان جو سارا سال سوشل میڈیا پر برباد کرنے کے بعد اس انتظار میں ہیں کہ کرونا کے باعث ہم بغیر امتحان پروموٹ ہو جائیں۔ یا جیسے سیاستدان نوکریاں نیلام کرنے کے ذریعے آئندہ الیکشن کے لئے رقم اکٹھی کرنے کے چکر میں ہیں کہ جیت کر ٹھیکے اور کمیشن سے کمائیں گے۔ ایسے ہی آجکل کی اولاد جو ویسے تو والدین کو پانی کا گلاس پلانے سے بھی لاچار ہونگے لیکن فادر زڈے پر کسی اچھی کاپی پیسٹ تحریر کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ باپ کو بھیجیں۔ اور ایسے نوجوان بھی دیکھے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ابو آج پرندے کی طرح پردیس کی طرف اڑے تو ان کے گھونسلے میں مالک بن کر بیٹھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی کامل درویش کی اوباش اولاد سیاستدانوں کی اولاد کی طرح مسند نشین ہونے کے لئے بے صبر ہوتی ہے۔ بس یہ جہان افراتفری کا ہے کہ جو بھی حاصل ہو۔ البتہ ہم تو یار کی یاری میں غرق ہیں اور منافق لوگ مفادات کے پیچھے دربدر پھرتے ہیں۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 8 جولائی 2021۔

موسمی اور غیر موسمی چیزیں

قانونِ فطرت ہے کہ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے، جیسے شادی میں خوشی، دکھ میں رونا۔ ایسے ہی جوانی والی مستی اگر بڑھاپے میں کی جائے تو خواری کے ساتھ ساتھ وقت کا ضیاع بھی ہوگا اور پریشانی بھی. ایسے ہی بارشیں اگر وقت پر ہوں تو درختوں میں جان آجائے گی، جانوروں سے لیکر آبادگاروں تک کے مزے۔ لیکن اگر موسم سے ہٹ کر کچھ ہوتا ہے جیسے گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی ہو جائے تو زندگی مشکل بن جاتی ہے۔

ہمارا معاشرہ بھی آجکل گرم سے سرد ہو گیا ہے۔ وقت سونے کا ہے تو بندہ جاگ رہا ہے، وقت جاگنے کا ہے تو بندہ مست سو رہا ہے۔ وقت دن کے کھانے کا ہے لیکن بندہ ناشتہ کر رہا ہے۔ اگر پوچھو تو کہتا ہے یہ جدید زمانہ ہے۔ شاباش نوجوان! باپ فجر سے چائے کے لئے پریشان اور نالائق بیٹا نیٹ پر چیٹنگ میں مصروف! یہ کیسی ترقی ہے؟ جہاں کپڑے پورے پہننے چاہییں وہاں عورتوں میں پھٹی ہوئی پینٹ پہن کر گھٹنے ننگے کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے، اور کام سے یہ نوجوان ایسے بھاگتا ہے جیسے نقلی فقیر نماز سے۔

اسی طرح ٹھگوں کی نئی قسم نکلی ہے۔ کہتے ہیں آئیں ہم آپ کی تربیت کریں۔ آپ کو ٹھگی کرنا سکھائیں اور ایسے جادوگری کے گر جو تین سو سے تین ہزار بنا کر دکھائیں۔ چونکہ آجکل ہر کوئی ہتھیلی پر جنت ڈھونڈ رہا ہے، ہر کوئی شارٹ کٹ کا راستہ دیکھ رہا ہے تو ایسے حضرات کامیاب ہوتے ہیں۔ اب جھوٹ کا موسم ہے۔ ہری گھاس بھی دال بن کر بکتی ہے۔ آٹے میں اگر مٹی کی ملاوٹ نہیں تو سمجھیں بیوپاری بالکل انجان ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو جھوٹ بولنا نہ آئے تو اس کا سیاست میں کیا کام؟ اور اگر کسی پیر کے پاس خلیفوں کی کمی ہے تو اسے پیر بننے کا کیا حق؟ ایسے ہی دوکان کے مالک کو اگر پیپسٹی سائیڈ کے کوپن پر جہاز کا ٹکٹ نہیں ملا تو وہ کیسا بیوپاری ہے؟ اور ڈاکٹر صاحب اگر دواؤں کی کمپنی سے ڈیل نا کریں تو خالی ڈاکٹری کس کام کی؟

مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر ہی اچھی ہوتی ہے۔ پھر جھوٹ کے موسم میں اللہ کے بیچارے بندے اگر بے موسمی باتیں کرینگے تو کون سمجھے گا؟ یہاں تو مری ہوئی فارمی مرغی فرج میں رکھ کر حلال بتا کر چلا دی جاتی ہے۔

تو ہوشیار ہو جائیں۔ ایسی مرغی سے فقیرانہ دال ہی بہتر ہے۔ دوستو! کم از کم موسمی تو ہے۔ آک کے پتے پر چھالیا ڈال کر پان بنا کر نہ کھائیں ورنہ پچھتانا پڑے گا۔

روزنامہ "پروان" منگل 29 جون 2021۔

نام بڑا شہر ویران

اگر ہم ارد گرد نظر دوڑائیں تو ہمیں کافی باتوں پہ تعجب اور حیرت ہو گی۔ ان پڑھ تو بیچارے ویسے ہی خوار ہیں، لیکن ہمارے معاشرے میں پڑھے لکھے جاہلوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ بھیڑ، بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہر کوئی ایک دوسرے کو کراس کرنے کے چکر میں چاپلوسیاں اور خوشامد سیکھنا زندگی کا قیمتی ہنر سمجھتا ہے۔ اگر کسی کو یہ ہنر آگیا تو وہ ایسے ترقی کرتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک صاحب کسی بڑے آدمی کے ساتھ ان کی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر ان کی ایک ریلی دیکھنے گئے۔ وہاں بڑا رش تھا اور ایک جنون کا سماں تھا۔ ایسے میں ایک آدمی نے مستی میں موٹر سائکل پر وکٹری کا نشان بناتے اور نعرے بازی کرتے انہیں کراس کیا۔ وہ خود بھی حیران ہوئے اور سوچنے لگے کہ یہ کون ہے؟

دو انگلیوں والا وکٹری کا نشان دراصل ہمارے معاشرے کے چند ناپاک چہروں پر ایک تھپڑ ہے۔ عام لوگ عزت دیکر نعرے بازی کرکے کچھ لوگوں کو بڑے منصبوں پر پہنچاتے ہیں، لیکن بدلے میں جھوٹے وعدے، انتظار اور ڈانٹ پھٹکار ان کا مقدر بنتے ہیں۔ ایسا کرکے دراصل یہ لوگ اپنی ہی نسلوں کے قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو وہ کامیاب کرواتے ہیں، وہی ان کو اپنا خریدا ہوا غلام، یا بھیڑ بکریاں سمجھ کر بیچتے ہیں اور فقط اپنا مال اور جاگیریں بناتے ہیں۔ اس کے برعکس بکے ہوئے، وکٹریوں کا نشان بنانے والوں کو بڑی دعوتوں پر فقط سیلفیاں ہی میسر آتی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ وقت کی قدر کریں اور زور سے مُٹھیاں بند کرکے اِن آدم خوروں سے دور بھاگیں اور یہ کہتے جائیں کہ "سب چلتا ہے"۔

روزنامہ "پروان" بدھ 6 جنوری 2021ء۔

لاکھوں کے ہیرے، ٹکوں میں بکیں

بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ پتے جھڑتے ہیں اور گرمیاں سردیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو یہ احساس ختم ہو جاتا ہے کہ کبھی گرمی بھی تھی۔ ایسے ہی جوانی اور مستیاں جب ساتھ چھوڑتی ہیں تو اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہتا کہ ہم بھی کبھی جوان تھے۔ ایسے ہی گھر کے کھانے کی بجائے جب ہوٹل تلاش کیا جائے تو سمجھ لیں کہ بیوی اور گھر کی مالکن نہیں ہیں یا انہوں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ ایسے ہی جب محفلوں کے لیے اوطاق (بیٹھک) کی جگہ ہوٹلوں اور فٹ پاتھ نے لے لی تو سنجیدگی غائب ہو گئی۔ جب گفتار میں بے ربط انجان جملوں نے جگہ لی تو مٹھاس اور چاشنی ختم ہو گئی۔ لائبریریوں کی جگہ موبائل کی معلومات نے لے لی تو استاد اور کتاب کہانیاں بن کر رہ گئے۔ جہاں بڑے بڑے تجربہ کاروں نے اپنے ہتھیار ڈال دیئے، وہاں ان ٹرینڈ (غیر تربیت یافتہ) مافیا سرگرم ہوئی اور عطائی پیدا ہوئے۔ محنت اور توکل کی کمی ہوئی تو ہر کوئی راتوں رات امیر اور بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ جب دن سونے میں اور رات آوارہ گردی میں گزرے تو ذہنی سکون دوائی اور منشیات میں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ لالچ نے لاکھوں کی بازیاں ڈبو دیں۔ تھوڑے منافع کے لئے جب بیکار سودے اور کاپی کلچر متعارف ہوا تو نقل نے اصل کو ڈھانپ لیا۔ ہر طرف ہر کوئی ماہر بن گیا۔ جب پڑھنے اور تحقیق کے بغیر صرف انگوٹھے کے اشارے سے تحریر کاپی پیسٹ کرنے والے ادیب سے اس تحریر کے بارے میں بھری محفل میں کوئی سوال پوچھیں تو وہ باتھ روم کے بہانے سے وہاں سے چلا جائے گا۔ اگر لیکچر رٹا مار کر دیئے جائیں تو سوال پوچھنے پر جواب ہی گول ہو جائے گا۔ اور ایسے ہی ناکامیاں ظاہری دکھاوے میں

چھپ جائیں گی۔ بڑی بڑی گاڑیوں اور جاہل لیڈروں کی لمبی فہرست میں با شعور کا نام بھی نہ آئے گا۔ جہاں عقل سنی ہوئی افواہوں کے نرغہ میں ہو وہاں علم اور عقل چھپ کر پہیلیاں نہ بجھائیں تو اور کیا کریں؟ جہاں لگن اور محنت سے لکھی گئی قیمتی کتابوں کے اوراق پکوڑوں کے لئے ردی کے طور پر استعمال کیے جاتے ہوں، جہاں دریاؤں کو خشک کرکے اس کی جگہ پر گٹروں اور نالیوں کے بدبودار پانی کو استعمال کرنے کو دانائی سمجھا جائے تو پھر دوش کسے دیا جائے؟ ایسی صورتحال میں داناؤں کو پاگل نہ سمجھا جائے تو اور کیا کیا جائے؟ جہاں تانبے، چاندی اور پیتل کو سونا بنا کر بیچا جائے، وہاں پر قیمت اور قدر کی بات کس سے کی جائے؟ جہاں نادانوں کے آگے بین بجائی جائے، فن فرمائش کے طور پر بیچا جائے، وہاں پر لاکھوں کے ہیرے کس قیمت میں بکیں گے؟

روزنامہ "سنگم" ہفتہ 05 جون 2021۔

بندر کو بندر نہ کہیں تو کیا کہیں؟

ہماری سوچ اور ذہن کے ساتھ اتنے بڑے بڑے کھیل کھیلے گئے ہیں، اتنے بڑے انتشار پھیلائے گئے ہیں کہ ہر کوئی اپنی ہانڈی الگ چولھے پہ چڑھاکے بیٹھا ہے۔ اوپر سے سوال پوچھتا ہے کہ یہ کیا پک گیا ہے؟ جب آٹے کو تم روٹی پکانے کے لئے توے پر رکھنے کے بجائے دیگچی میں پکا رہے ہو تو پھر پوچھتے کس لیے ہو؟ ایک بات ضرور ہے اگر اس میں کوئی سبزی ڈالو تو سالن بن جائے گا۔ روٹی تو نہ بنے گی لیکن گریوی اچھی بن جائے گی۔ ذائقہ نہ سہی پیٹ بھر جائے گا۔ لیکن مخلوقِ خدا کو یہ نہیں کھلانا۔ پہلے ہی بیچاری مخلوق پریشان ہے۔ انسان کی نسل تو جیسے مٹ ہی گئی ہے۔ کسی کو کیا کہا جائے؟ بالوں کی کٹائی دیکھتے ہیں تو بندا جیسے مرغا لگ رہا ہے۔ شلوار دیکھو تو گھٹنوں سے اوپر کھینچی ہوئی ہے۔ اگر قریب ہو کر پوچھا جاتا ہے کہ بیٹا یہ کیسا لباس زیب تن کیا ہے تو ایکدم کانوں سے سفید دھاگے باہر نکالتا ہے (بعد میں چلتا ہے کہ کوئی فون کا سسٹم چالو تھا) اور منہ سے پھوارے مار کر کہتا ہے میں تو بر گر بوائے ہوں۔

برگر کا ہم نے چاچو قادن سے سنا تھا جس نے ایک دفعہ تولو مولو سے لیکر کھایا تھا۔ پھر وہ بال بال بچا تھا وہ بھی خالو ہوٹل والے کی مہربانی سے جو اس نے کالی چائے میں جلاب والی دوائی ملا کر پلادی۔ تب جاکر پیٹ صاف ہوا۔ خالو ہوٹل والا اپنی بکری کا پیٹ پھول جانے پر اس کو کالی چائے ہی پلاتا تھا۔ ویسے بھی سائیں سرمائی اور لکھانو دونوں خربوزہ کھانے کے بعد اس کے اوپر کالی چائے پیتے تھے۔

آج کل تو سوشل میڈیا پر ہر کوئی لائیو آتا ہے۔ کہتا ہے دنیا میں بس میں ہی پیدا ہوا ہوں۔ نام تو اتنے بڑے بڑے پر منہ میں کچھ بھی نہیں۔ خبریں ایسی جو ساری کائنات ایک طرف اور اس کے خیالات دوسری طرف۔ الفاظ بھی ایسے ایسے استعمال کر رہا ہے جیسے مرغی کے انڈے سے مشین سے نکلا ہو چوزہ۔ اب فیڈ کھا کر نہیں مانتا کہ میں فارمی مرغی ہوں۔ وقت شکلیں اور ذہن بھی بدل دیتا ہے لیکن قلب کو قرار دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی ذہنی طور پہ بندر ہو کر انسانی شکل، اختیار کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، البتہ سوچ تو بندر والی ہی رہے گی۔

روزنامہ "سنگم" منگل 01 جون 2021۔

وحشی پن

جب انسان میں حیوانیت داخل ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے وہ ذہن کو متاثر کرنے لگتی ہے۔جب اس کی مقدار بڑھنے لگتی ہے تو وہ حیوانی حرکتوں میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔جب وہ حرکتیں فرد سے نکل کر افراد اور انفرادیت میں سے نکل کر اجتماعیت میں آنا شروع ہو جائیں تو سمجھ لو کوئی بڑا المیہ جنم لینے والا ہے۔ شاید انسانیت ہی ختم ہو رہی ہے یا انسانیت میں کوئی بڑا قحط برپا ہونے والا ہے۔ تاریخ میں ایسی بڑی بڑی سبق آموز داستانیں ملتی ہیں۔خونریزیاں، تباہیاں، ہٹ دھرمیاں، ظلم اور انتہا پسندی، وحشی پن کی بہت سی اقسام سامنے آتی ہیں۔ اس میں عورتوں کی تذلیل، والدین اور رشتہ داروں سے بے ادبی اور اسی طرح کی کئی اور کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ ہوس کے مریضوں کے حملے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لٹیروں کے بارے میں سنتے آرہے ہیں۔ ماضی میں لٹیروں کے بھی کچھ قواعد اور قانون ہوتے تھے۔ لیکن آج کی دنیا میں تو عجب وحشی پن دیکھا ہے۔ کچھ سالوں سے معصوم پھول جیسی بچیاں جنہیں تمام مذاہب نے عزت بخشی ہے وہ بھی محفوظ نہیں۔ ہمارے پیارے آقا کریم ﷺ نے تو ایک بیوہ عورت سے لیکر ایک معصوم بچی تک کے اتنے حقوق بتائے ہیں۔پر بڑے افسوس کی بات ہے۔ الفاظ لبوں پر لاتے ہوئے شرمندگی ہو رہی ہے کہ آج انسان کہلانے سے حیوان کہلانا بہتر ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مقصد صرف ماتھا پیٹنا نہیں۔ یہ سب اس جدید دور میں ہو رہا ہے جب انسان ترقی کا دعوی کرتا ہے۔ انسانی حقوق کا علمبردار کہلاتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فالٹ کہاں پر ہے؟ جو ایسے اذیت ناک واقعات روز بہ روز سننے میں آتے ہیں؟ کیا معاشرے کو تربیت کی ضرورت ہے؟ یا تعلیم میں وہ اصلیت نہیں رہی جو ہمارے معاشرے کی معصومیت کو سکون فراہم کرسکے؟ آنے والے وقت میں والدین سکول، کالج کے علاوہ کہاں کہاں اولاد کی نگرانی کریں گے یا ان کا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری یا نوکری کریں گے؟

اب تو انسانی چہروں سے وحشت آرہی ہے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ معاشرے میں موجود انسانیت کے فقدان کا اصل سبب اس تعلیم اور تربیت سے عملی دوری تو نہیں جو رہبر انسانیت سے ہمیں ورثے میں ملی ہے؟ کہیں ہمارے پاس خالی باتیں ہی تو نہیں رہ گئیں؟ اللہ تعالیٰ ہمیں آدمی سے انسان ہونے کی طاقت دے۔

روزنامہ "پروان" منگل 25 مئی 2021۔

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور

ہم ہمیشہ سے ایک چھپن چھپائی والا کھیل دیکھتے آئے ہیں۔ کافی عرصے سے یہ دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ ظاہری باتوں اور اندرونی کہانیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جیسے اپوزیشن لیڈر اور اقتدار والے لیڈر بظاہر ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں، لیکن جب مفادات ایک ہو جاتے ہیں تو وہ شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک فرقے کے مذہبی پیشوا جو دوسرے فرقے والوں کو کافر اور جاہل کہتے ہیں، ایک دوسرے کی مسجد اور امامت میں نماز بھی نہیں پڑھتے، وہ بھی عام لوگوں کو بیوقوف بناتے بناتے ذاتی مقاصد کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔

تو گویا ذاتی مفاد ہمیں اجتماعی مفادات سے زیادہ عزیز ہیں۔ ہم کسی بھی شعبہ میں ہوں، ذاتی مفادات ہمیں انسانیت اور مُلک کی فلاح و بہبود سے ہٹا کر ایک کر دیتے ہیں۔اور پھر اتحاد قائم ہو جاتے ہیں۔ اجتماعات، احتجاج، تقریریں وغیرہ وغیرہ شروع ہو جاتی ہیں، لیکن جب کام نکل جاتا ہے تو سب منتشر! ہر میدان میں ذاتیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نتیجتاً اجتماعیت پہ انفرادی مفاد حاوی ہو جاتا ہے۔ تب ہمارے معاشرے میں اجتماعی کام کرنا اور اس طرف لوگوں کو متوجہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔بڑے بڑے اتحاد قبیلوں میں، تنظیموں میں، ذاتوں میں اور رسموں میں تبدیل ہو جاتے ہیں حالانکہ سارے انسانوں کے مفاد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن انفرادی سوچ اور ذہن میں صرف خود سے وابستہ مفادات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر متعلقہ پلیٹ فارم استعمال کرکے اپنے ذاتی مفاد اور مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو اُن کو اتحاد میں لیکر چلنے والوں سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی۔ بس کام نکلا اور کاغذ پھٹا۔ ایسے شعبدہ بازوں نے دین اور مذہب سے لیکر فلاحی فورم بھی بے دریغ استعمال کئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ بیچارے نا سمجھ انسانوں کو

استعمال کرکے ان سے نعرے لگوا کر اپنی ذات اور خاندان کے فوائد کے لئے آگے لا کر خود پردے کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں نکل کر سامنے آجاتے ہیں۔ سزا و جزا کے لئے البتہ عام لوگ رہ جاتے ہیں۔ان کو صرف واہ واہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ جیسے کسی پیر کا خلیفہ، لیڈر کا نعرے باز کارکن، وڈیرے کا چاپلوسی کمدار، آفیسر کا گاہکوں کو لا کر جال میں پھنسانے والا ٹاؤٹ جو آفس میں قریب ہی کام کرنے والا ہوتا ہے۔ گویا سامنے کچھ اور پردے میں کچھ اور ہے۔ ایسے ہی جیسے ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور ہوتے ہیں۔

اگر ایسے مفاد پرست لوگوں کو انسانوں کے لباس میں کسی بھی شعبہ میں دیکھو تو احتیاط کرنا۔ ہو سکے تو دست بستہ ان سے دور بھاگنے کی کوشش کرنا۔

روزنامہ "پروان" پیر 17 مئی 2021۔

روزنامہ "سنگم" پیر 17 مئی 2021۔

ہیرا پھیری میں بھی ہیرا پھیری

کبھی کبھی ایک بات سے بہت سی باتیں بنتی ہیں اور کبھی تو حلوے سے دال بھی بنتی ہے۔ اور یہ بھی سنتے ہیں کہ بریانی سے ربڑی بھی بنتی ہے۔ سو جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی گئ بہت سے جاہلوں کو من گھڑت جمالے (راگ، گیت) سناتے دیکھا۔ جب ان جمالوں میں گھوٹالے (گڑبڑ) آکر ملے تو سب جمال گوٹا (جلاب آور دوائی) بن گئے۔ اسی طرح تھادل پینے والے ٹھنڈے دماغ کے لوگ خود کو ذہین، چست اور تیز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے چہرے ایسے ہوتے ہیں جیسے بجھا ہوا دیا، جیسے صدیوں سے صدا کی صفت کھو بیٹھے ہوں، پریشان، بے حال، ادب اور اخلاق کے بوجھ تلے دبے ہوئے بوڑھے، جنونی بیمار، بے آرامی کے مریض لگتے ہیں، یہ مردہ روح لوگ جب معاشرے میں کوئی عمل کرتے ہیں تو ہر بات کا کباڑہ کرکے رکھ دیتے ہیں. اور فطرت کی ساری خوبصورتیوں کو چھیڑ کر ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں، ان کی چھوٹی سی سوچ، مذاقیہ حرکتیں اور لامحدود کو محدود کرنا، یقیناً یہ شرارت ایک مردہ انسان دل کی سوچ کے مطابق تو ہو سکتی ہے، لیکن یہ عقل اور شعور کے مطابق نہیں ہے بلکہ انسانیت کو پیروں تلے کچلنے کے برابر ہے۔اور ایک احساس محرومی کے شکار اور کم ظرف پریشان حال ذہنیت کی عکاس ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کائنات اور اس کے تخلیق کار پر بے اعتمادی کا کھلا ثبوت ہے۔ اس طرح خدا کی تقسیم سے ناامید چھوٹی قامت کے زہریلے اشخاص دنیا کی خوبصورتی اور رنگینیوں میں کھو کر اپنا سب کچھ لٹا کر اپنی جان و مال کا جنازہ کرا دیتے ہیں۔

کچھ لوگ وقت اور موجود صورتحال کو سمجھنے کی بجائے اپنی سازشی شعوری طاقت سے ہیرا پھیری کرکے حیرانگی کی حد تک کم ظرفی کے غلط عمل کرکے اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں، اور قدرت یا پھر قسمت پر الزام دھرتے ہیں، لیکن ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ قدرت کی مرضی کے بغیر ناممکن کو بھلا کیسے ممکن کہا جائے؟ موجود قدرت کو ناموجود تسلیم کرنے والے لوگوں کا گمان الو جیسا ہوتا ہے جس کو سورج کی روشنی بے نور بنا دیتی ہے۔ایسے نادان، لیکن خود کو دانا بلوانے والے لوگ جو جامن کے درخت سے آم کھانے کے لئے نکل پڑتے ہیں، کیکر کے درخت سے بیر توڑنے کی کوشش کرتے ہیں اپنی کوشش میں ناکام ہو کر، بھولا سا منہ بنا کر چارپائی کو الٹا کرکے سو جاتے ہیں۔ بس زمانے سے یا قدرت سے ایسی ہیرا پھیریاں کرنے والے لوگوں کو گزرتا وقت ناکام بنا دیتا ہے۔

روزنامہ "پروان" منگل 11 مئی 2021۔

اوجھڑی کبھی گوشت نہیں بنتی

کہتے ہیں کہ گوشت کو کبھی اوجھڑی نہیں کہا جاسکتا۔ایسے ہی اوجھڑی کو گوشت میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دونوں چیزیں ایک ہی جانور سے ملتی ہیں مگر دونوں نے اپنی پہچان الگ الگ بنائی ہے۔ ایسے ہی انسان ایک جیسے اعضاء اور نقش رکھنے کے باوجود ایک جیسی پہچان نہیں دے سکتے ۔ کسی کا اخلاق ایسا اعلیٰ ۔ بات کرے تو جیسے موتی بکھر رہے ہوں۔ دل کرتا ہے کہ بس سنتے اور دیکھتے ہی جائیں۔ اور کوئی ایسا بخیل اور عصیل کہ لوگ اللہ سے دعا کریں کہ یا اللہ مجبوری میں بھی اُس کے منہ لگنے سے بچانا۔ ایسے ہی کسی کا اقتدار عوام کے لئے فائدہ مند ہے تو کسی کا فتنہ اور وبالِ جان سے کم نہیں۔ کسی کی دعوتیں اور دستر خوان وسیع اور خلوص والے ہیں، تو کسی کے بنگلے آسیب زدہ لگتے ہیں۔کچھ لہجوں اور لفظوں کی مٹھاس دلوں کو چرا لیتی ہیں، تو کچھ لوگوں کی باتیں تیر کی طرح چبھ کر صرف نفرتیں ہی نفرتیں بکھیرتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی تحریریں اور اشعار راحت بخش اور کچھ کی تحریروں اور اشعار میں حسد، بغض اور شرارتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جب نفرتیں دل سے نکل کر زبان سے ہوتی ہوئی فیس بک پر پہنچیں تو جان لو کہ بغض اور حسد کی اوجھڑی پھٹ گئی اور اب گندگی باہر آ رہی ہے۔ اگر کوئی کامل مرد دھوبی بن کر بھی دھوئے تب بھی صاف ہونا مشکل ہے۔ تو کیوں نہ ایسے عناصر سے مٹھیاں بند کرکے بندہ دور بھاگنے کی کریں۔

روزنامہ "پروان" ہفتہ 08 مئی 2021۔

چلتے ہیں کچھ لوگ ہوا کے ساتھ

یہ انسانی فطرت ہے کہ لوگ زمانے کا رخ دیکھ کر خود کو موڑتے ہیں۔ہر کوئی کسی نہ کسی کی نقل کر رہا ہے۔ بیشک بعد میں پتا چلے کہ غلطی ہو گئی۔ نقل کرنا ویسے بھی آسان ترین کام ہے۔اس میں زیادہ آسانی سوشل میڈیا نے کر دی ہے۔ بس رخ دیکھا نہیں اور چہرہ پھرا نہیں۔ کسی زمانے میں جناح ٹوپی کا رواج تھا، پھر ترکی ٹوپی۔ بہت سی ٹوپیاں آئیں اور گئیں۔اور اسی طرح لباس بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ ایسے ہی ہر لیڈر نے اپنے پیروکاروں کو اپنے جیسا لباس پہنانا شروع کیا۔اور پھر سیاسی شخصیات سے متاثر کچھ عناصر نے اس شوق کو جاری رکھا۔ لباس تک تو نقل ٹھیک ہے لیکن اگر لہجوں میں بھی اچھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں تو بہتر ہو۔ اچھی بات کی نقل کرنا اچھا رجحان پیدا کرتی ہے ، لیکن اگر غلط رویوں اور غلط لہجوں اور خاص طور پر جھوٹے الزامات اور تعصّبات کی نفرت انگیز نقلیں سارے معاشرے کے ماحول کو مجموعی طور پر تبدیل کر دیں تو پھر نقصان پورے معاشرے کا ہے۔ رشتوں کے ساتھ کھلواڑ والے مہلک رویئے کلفتوں کی دکانیں کھول دیتے ہیں۔ خاص طور پر آج کل بڑی دکان سوشل میڈیا پر ہوتی ہے۔

تولو مولو آپس میں کسی بات پر ہنس رہے تھے تو انکو دیکھ کہ چاچا قادن بھی خوامخواہ میں ہنس رہا تھا۔ تولو نے پوچھا کہ چاچا کچھ سمجھا بھی ہے یا خوامخواہ ہنس رہے ہو؟ جواب میں، اس نے کہا، "بیٹا سمجھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سائیں سرمائی نے تو صاف کہہ دیا:

"بچو! دنیا کے ساتھ چلنا ہے۔آپ ہنس رہے ہو تو میں بھی ہنس رہا ہوں۔ اگر آپ رونے لگیں گے تو میں بھی یقیناً اُسی طرح رونے کی کوشش کروں گا۔ درست بات نہ پوچھیں گے، نہ سنیں گے، نہ ہی سمجھیں گے۔ بس دنیا جیسا ہونے کی کوشش میں ہیں، پھر جو رخ زمانے کا وہی ہمارا ہوگا"۔

روزنامہ "پروان" پیر 03 مئی 2021۔

لائبریریاں اور لاپرواہیاں

ماماخدن کی افطار پارٹی پر ساری سنگت اکٹھی ہوئی۔ فقراء اور گاؤں کے لوگوں کی تعداد کے لحاظ سے کھانے پینے کی اشیاء لاکے اکٹھی کی گئیں۔ ماماخدن کے دوستوں کی یہ عادت رہی ہے کہ جو بھی آئے گا گھر سے کچھ نہ کچھ لازمی لیکر آئے گا۔ وڈیرا ادیب روزے تو نہیں رکھتا لیکن احترام باقاعدہ کرتا ہے۔ پکوڑے اور چٹپٹی چیزیں ساتھ ضرور لاتا ہے کیونکہ خود ہمیشہ چٹپٹی چیزیں کھاتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر نواز سائیں یہ چیزیں نہیں کھاتا لیکن ادیب اسے بھی کھلا دیتا ہے۔ پھر دونوں ہنستے ہیں۔ ایسے ہی خالو ہوٹل والا بچے ہوئے دودھ سے ملائی اتار کر اس میں ملک روز بنا کر لاتا ہے۔ سودائی شمشو ادھار پر چپس اور اپنی زمین سے کچی بھنڈی لے کر آتا ہے کیونکہ پکانے کے لئے خالو ہوٹل والا موجود ہوتا ہے۔ ایسے ہی تولو مولو کا ذمہ فقط کھانے اور کھلانے کا ہے۔ باقی سائیں سرمائی اور لکھانو مرضی کے مالک ہیں، وہ صرف دعا پڑھتے ہیں۔

آج افطاری سے پہلے وڈیرے ادیب نے ایک ایسی بات کہی جو سب کے دل کو لگی۔ اس نے کہا دوستو، دیکھیں پہلے ہر وڈیرے کی اوطاق میں روزانہ کی بنیاد پر اخبار پڑے رہتے تھے۔ ہوٹل والے کے پاس، سیلون والے کے پاس اور پیڈی والے کے پاس۔ اور گاؤں یا شہر کے پارکوں میں لائبریریاں ہوا کرتی تھیں جہاں سے چھوٹے بڑے کتابیں پڑھنے کے لئے لیکر جایا کرتے تھے۔ اور وہ واپس کر کے دوسری کتابیں لے جاتے تھے۔ کتابوں کا اتنا رجحان ہوا کرتا تھا کہ بابا مرحوم ہم سب کو گرمیوں میں نیم کے درخت کے نیچے بٹھا کر کہانیاں سناتے رہتے تھے۔ کبھی قصص الانبیاء تو کبھی داستان امیر حمزہ وغیرہ۔ وہ آج تک ہمارے دلوں پر نقش ہیں۔ یہ کبھی نہ ہوتا کہ ہم ادھر اُدھر فالتو گھومنے جائیں۔ اب تو سحری سے افطاری کے وقت تک ہر کسی کے ہاتھ میں موبائل فون ہوتا ہے باقی کچھ خبر نہیں۔ اگر پیکج ختم ہو جائے تو ساری فیملی میں ماتم مچ جائے۔ پتا نہیں کونسی

ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ مانتے ہیں جدید ٹیکنالوجی ضروری ہے لیکن اس نے ہم میں سے ادب اور حیا ختم کر دی ہے۔

ماماخدن نے بات آگے بڑھائی: "کتابوں کا شوق ختم ہوتے ہی علم اور عقل دم توڑ گئے۔ معلومات کے ذخیرے بیشک اکٹھے ہوئے پر لاپرواہیاں بڑھنے کی وجہ سے سارا کلچر اور تاریخ گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ جہاں کتابیں چھوٹے اور بڑے کا لحاظ سکھلایا کرتی تھیں وہاں انٹرنیٹ نے ہمیں غلط کاریوں کے جدید طریقوں سے آشنا کر کے ایسی گیمز متعارف کروائیں ہیں جن میں نہ کوئی ذہنی شعور ملتا ہے، نہ علمی۔ صرف قیمتی ٹائم ہاتھوں سے نکلتا جارہا ہے"۔

ایسی ماہرانہ گفتگو نے روزے کی ساری بھوک اور پیاس ختم کر دی، سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 29 اپریل 2021۔

روزنامہ "رئیس" لاہور پاکستان، جمعرات 29 اپریل 2021۔

ہدہد اور طوطا

طوطائی رنگ جہاں دلفریب ہے وہیں خوبصورتی کی علامت بھی ہے۔ ہرا رنگ ہماری زندگی کے بہترین رنگوں میں شمار ہوتا ہے۔ بولنے والے طوطے گھروں میں پالے جاتے ہیں۔ طوطے کے بولنے کا دلچسپ انداز بچوں،بڑوں کی تفریح کا سبب بنتا ہے۔ خاص طور پر بوڑھی ماں، نانی، دادی کے اکیلے پن کا ایک دلچسپ علاج ہے۔

طوطا بہت پرانا پرندہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثنوی رومی (حضرت جلال الدین رومی رح کی لکھی ہوئی کتاب) میں بھی طوطے کی دانائی اور سیانے پن کا ذکر کیا گیا ہے۔

آم کے باغات اور درختوں سے طوطے کی قربت اور نسبت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ جیسے ہی ہمارے پاس آم کے باغات ختم ہونا شروع ہوئے طوطے غائب ہونے لگے۔ یقیناً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مستقبل کی رہائش گاہ کا مسئلہ پیدا ہونے لگا ہے۔ باغ اور باغیچوں سے عدم دلچسپی کے اسباب ڈھونڈ نا بیدار مغز لوگوں کا کام ہے، ان سمجھدار لوگوں کو ایسے دلچسپ اور نایاب پرندوں کی گمشدگی پر غور کرنا چاہیے۔

طوطے کی طرح آج کل انسان اور خاص طور پر انسانیت نایاب ہوتی جارہی ہے، اس کی جگہ پر کرنے کے لئے اس کے متبادل مصنوعی انسان جنم لینے لگے ہیں۔ جو ان اصلی انسانوں کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح اصل سونے کی جگہ مصنوعی زیورات مارکیٹ کی زینت بنے ہیں۔ ایسے ہی ہر جگہ متبادل سسٹم رائج ہونے لگا ہے۔ اسی طرح طوطے بھی اب باہر کے ممالک سے منگوا کر بازار میں فروخت کیے جاتے ہیں۔

آم کے درخت میں طوطے کا گھر بنانے کا کام اصل میں بیچارہ ہدہد کرتا تھا۔ جس کی لمبی نوک والی چونچ اس لکڑی میں بہترین گھر تیار کرتی تھی۔ بالکل ان اصلی لوگوں کی طرح جو اپنی خانقاہوں اور درسگاہوں میں تعلیم اور تربیت سے۔بڑے باکردار انسان بنانے کے لئے ایک فیکٹری کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان اداروں سے جو بھی فارغ التحصیل ہوئے وہ دنیا کے عظیم رہبر، صوفی، معلم، سخی اور بہادر انسان بنے۔ آج بھی انکی باتیں یاد کی جاتی ہیں۔

کوشش کرنی چاہیے کہ ذہنوں کو جوڑنے والے ایسے ہدہدوں کو ڈھونڈا جائے۔ لیکن ایسے باغات بھی اگائے جائیں جہاں وہ آئیں، آکر آستانے بنائیں اور رہیں۔

روزنامہ "رئیس" لاہور پاکستان، روزنامہ "اردو بلیٹن" پیر 26 اپریل 2021۔

کرشماتی کردار

دانا راہبر کی موجودگی انسانی سماج کی ضرورت ہے۔ ہزاروں افراد میں سے کسی ایک کو ہی رہبری کرنی ہوتی ہے۔ چاہے کوئی آفس ہو یا مسجد، سیاسی پارٹی ہو یا روحانی گدی، یا کوئی درسگاہ۔ اب رہی بات شخصیت کی تو صاف ظاہر ہے کہ کچھ شخصیات سحر انگیز ہوتی ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ سحر کب تک چلتا رہتا ہے؟ بعض کا ان کی موت تک یا اس سے بھی آگے کچھ وقت تک۔ لیکن بعض شخصیات کا سحر صدیوں تک چلتا رہتا ہے۔ وہ سحر اُس کے کردار کا ہو، اخلاق کا ہو یا اس کے قلم کا، یہ تعین تاریخ کرے گی نہ کہ وہ خود۔ نہ ہی وہ شخصیت تعین کرتی ہے کہ اسے سحر انگیز کہا جائے۔ بس ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ قدرتی فعل ہے۔ پھر دنیا چھوڑنے کے بعد اس کی جگہ پر آنے والے کے لیے بھی لازم ہو جاتا ہے کہ کام چلانے کے لیے مجبوراً اس سحر انگیز شخصیت کا سہارا لے۔ تقریروں، جملوں اور اقوال کی صورت میں اس عظیم شخصیت کی نقل کرنا وقت کا تقاضا بن جاتا ہے۔ اگرچہ حاسدوں اور جلنے والوں کو یہ پسند نہ ہو مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس سحر انگیز شخصیت کا نام گنوانا پڑ جاتا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں، جماعتیں اور گدی نشین ابھی تک ان سحر انگیز شخصیات کی محتاج بن کہ چل رہے ہیں۔

تو شخصیت پرستی کا طعنہ دینے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی عظیم انسان کبھی بھی یہ نہیں چاہتا کہ مجھے کچھ سمجھا جائے۔ مگر تاریخ اس کو انمول کردار اور شخصیت بنا دیتی ہے۔ انسان تو فانی ہے، دنیا کو چھوڑنا تو ہر کسی کو پڑے گا۔ بقا صرف اللہ پاک کی ذات کو ہے۔ پھر وہ بقا والا جس کو چاہے یاد رکھوائے، کسی بھی طریقے سے۔ آج بھی دیکھیں شاہ صاحب بھٹائی رح کے شعر اور رومی کی مثنوی یا ان جیسے کرداروں کی تعریف کی جاتی ہے اور انکی تعلیم یاد رکھی جارہی ہے۔ ان کے الفاظ میں سحر انگیزی اور مقناطیسی کشش ہے۔

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حسد اور جلن ضرور سر اٹھاتے ہیں۔ حاسدوں کو اور کچھ نہیں ملتا تو شخصیت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شخصیت پرستی بگاڑ نہیں۔ اعلی شخصیات کے کردار، تعلیم اور درس سے فائدہ اٹھانا ہی عقلمندی ہے۔ باقی اب لوگوں کی مرضی ہے کہ کونسا رخ لیتے ہیں۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 25 مارچ 2021۔

آج کا ہائبرڈ انسان

آج کا انسان ذاتیات میں اتنا مگن ہو گیا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے علاوہ اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ جہاں بھی اپنے مفاد کا ٹکراؤ محسوس کرتا ہے وہاں سب حربے استعمال کر لیتا ہے۔ وہ مختلف باتیں اور جھوٹ، چال بازیوں اور چالاکیوں سے انسانوں کے احساسات کا قتلِ عام کر کے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔اس حد تک کہ اگر خونی رشتوں کو پامال کرنا پڑے تو بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا اور نکل پڑتا ہے انکو پامال کرنے۔دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو بس جائیدادیں بنانے کے چکر میں ہے۔جب آج کے کچھ ایسے انسانوں سے ملاقات ہوتی ہے تو سچ سمجھو خون کی بُو آنے لگتی ہے۔ لگتا ہے کہ ان کا پورا دامن انسانوں کے خون سے رنگا ہوا ہے۔پر باتیں مذہب اور کردار کی ایسے کرتے ہیں جیسے بڑے نیکوکار ہوں۔ وہ عبادت گاہوں سے نکلتے ہی زہریلے سانپوں کی طرح زہر پھیلاتے نظر آئینگے۔ پھر چاہے کاروبار ہو یا کوئی بھی اور میدان، بات پھر بھی اپنے مفاد پر آ کے اٹک جاتی ہے۔ان سے ملتے وقت آپکو ایسی مادیت پرستی کی بدبو آئے گی کہ آپکو گھن آئے۔ گفتگو میں کہیں کہیں اداسیوں کی باتیں بھی کرنے لگیں گے اور کہیں گے کہ پوری زندگی بھاگ دوڑ میں گذار دی دوسروں کی حق تلفی کر کے سکون لینے کے لیے۔ دنیا اکٹھا کر لی، سکون والے ظاہری اسباب سب جمع ہو گئے، مگر سکون نہیں رہا۔نہ اولاد رہی نہ کوئی ساتھی ساتھ بچا۔بس مال ملکیت اور بے آرامی پوری زندگی کا سامان بن کر رہ گئے۔اب تو راتیں جاگ جاگ کر تھک گئے ہیں۔ نیند آتی ہی نہیں۔ دوائیاں کھا کھا کر بیمار ہو گئے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا وطیرہ تھا کھانے پینے والی چیزوں میں ملاوٹ، بازاروں میں روزمرہ سامان کی ذخیرہ اندوزی کر کے بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے گودام بھر کے رکھنا، کسی کی مجبوری میں سود پر چیک رکھ کر رقم دینا اور کہنا کہ یہ تو کاروبار ہے۔ پھر ہر سال اپنے پورے خاندان کہ ساتھ مقدس جگہوں پر حاضریاں دیکر رب پاک، جو پورے عالم کا رب اور تخلیق کار ہے، اس سے بھی کاروبار کی طرح لین دین والا سودا کرنا، جیسے اس ہستی کو کچھ پتا ہی نہیں یا جیسے یہ اس کی مخلوق ہی نہیں۔اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کیا ہیں۔ ٹھگیاں انسانوں سے تو کرتے ہی ہیں مگر مگر اپنے خالق سے بھی؟ واہ ! واہ! اے انسان! تمہیں لالچ نے مروایا ہے۔جس دنیا کو تم ہمیشہ رہنے کی جگہ سمجھتے ہو، جو مال و دولت تم نے اکٹھا کیا ہے وہ تمہیں ایسے نکال کر باہر پھینکے گا کہ تجھے آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ کس چیز کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟ نخرے چھوڑو! انسان بن جاؤ، انسان!

روزنامہ "پروان" جمعرات 11 فروری 2021۔
روزنامہ "مشرق"، لاہور، جمعرات 11 فروری 2021۔
روزنامہ "افلاک" لاہور، جمعرات 11 فروری 2021۔

لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی

انسان کی بناوٹ بھی عجیب ہے۔اس کی فطرت میں تضاد اور انتشار نمایاں ہے۔ جب بھی ہاتھ میں کھجلی ہوتی ہے تو پاس والوں کو غصے میں چٹکیاں کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی وہ کامیاب ہوتا ہے تو کبھی اسکو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ مگر عادت سے مجبور شخص کیسے چین سے بیٹھے؟ جس کے ذہن میں چغل خوری کا فتور موجیں مار رہا ہو وہ بغیر چغلی کیے کیسے سکون سے بیٹھ سکتا ہے؟ وہ تو بیٹھے بیٹھے بھی مرغے کی طرح اندر ہی اندر میں جھوم رہا ہوگا جیسے کوئی موالی نشے میں دھت کبھی گردن زمین کی طرف اور کبھی آسمان کی طرف گھماتا ہے۔ایسے گرج رہا ہوگا کہ جیسے ابھی برسنے والا ہے مگر پاس سے آہستہ آہستہ بغیر برسے گذر جائے گا۔جب خمار اترے گا تو دوادارو کے لیے پورے گھر کو سر پر اٹھالے گا۔گھر والے تو بچارے پھنسے ہی پھنسے مگر پورا محلّہ بیزار ہو جاتا ہے۔ذرا سا سامان میسر ہوا نہیں تو پھر ناچنا شروع ۔ کس بات پر ناچ رہا ہے پتا خود کو بھی نہیں۔ جیسے آجکل کی عوام کہ ہر کسی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہے پتا کچھ بھی نہیں۔ فساد میں بھی ساتھ ، غم میں بھی۔مار پیٹ میں بھی ساتھ ، پھر ناچنے میں بھی ساتھ ۔ تالیوں پر تالیاں۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام نے کتنی ترقی کی ہے۔کچھ کرسیوں پر موجود، کچھ کرسیوں پر نظریں جمائے ہوئے، اور کچھ چاپلوس تو کرسیوں کے نیچے۔ ہر طرف مارا ماری لگی ہوئی ہے، راستے، گلیاں، گاؤں اور پھر سوشل میڈیا ، جھڑپوں اور جھگڑوں کا میدان بن گئی ہیں۔ تبصرے، تماشے، چٹکیاں ، گدگدی اور پھر شرارتیں اور مذاق، پھر چاپلوسی کی مالشوں پر زور ایسے جیسے پہلوان اکھاڑے میں اترنے والا ہو، رگڑے پر رگڑا جاری ہے۔ کالے آگے ، عوام پیچھے ، چاپلوسی ختم ہو تو کوئی بھلا کام ہو۔ اس وقت تو خرابی ہی خرابی ہے۔ راستے ایسے تکلیف دہ جو کمر درد ہو جائے۔ملاوٹ اتنی کہ دال کے بدلے میں ملے مانجھلی کا بیج۔آٹا چھانا جائے تو بھوسہ ہی بھوسہ۔ دودھ کی تو صرف سفیدی ہی رہی باقی تو پتا نہیں کیا ملاوٹ کی جا رہی ہے۔بس عرضِ عاجزانہ یہ ہے کہ چاپلوس چاپلوسیاں کرنا چھوڑ دیں، دوسروں کے ڈھول پہ ناچنا چھوڑ دیں، اور اپنے قدرتی آہنگ میں واپس آجائیں۔

جعلسازوں سے ہوشیار!

جب رات خود کو دن سمجھنے کی غلطی کرے، اندھیرا خود کو روشنی کا چراغ سمجھنے لگے یا کوئی دیا خود کو سورج کہے ، گیدڑ شیر ہونے کا دعویٰ کر دے، چوہے کو ہلدی مل جائے اور وہ پنساری بن کہ بیٹھ جائے ، کوئی خالی کرسی پر بیٹھ کر اس کو تختِ سلطنت سمجھنے کا دھوکا کھالے، کوئی کسی عام پتھر پر پاؤں رکھ کر بولے کہ میں سنگ مرمر پر بیٹھا ہوں۔ اگر کوئی خود کو سوشل میڈیا پر پرنس کہلوائے اور سپنوں اور خیالوں میں بھی ایسا محسوس کرنے لگے۔بیٹھ کر گدھا گاڑی پر سمجھے کہ مرسیڈیز کار چلا رہا ہوں تو ایسے ہی ہے کہ کوئی اس جھوٹی دنیا کو حقیقی سمجھ کر، اس عارضی زندگی کو دائمی قرار دیکر ہمیشہ رہنے کی آرزو کرلے۔یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟۔اس کو تو شرمندگی ہی اُٹھانی پڑے گی۔

ہو نوکر، اور دعوی کرے مالک ہونے کا! کسان ہوتے ہوئے شوق پالے زمیندار کہلانے کا! نائب قاصد ہو پر بن بیٹھے افسر! ہو چور، کہلائے چوکیدار! دیکھے پیر چور کے، کہے مالک کو چور! سرد ہوا کو گرم ہوا سمجھنے لگ جائے یا جیسے کوئی سٹیتھوسکوپ (stethoscope) گلے میں ڈال کر بولے میں ڈاکٹر ہوں۔اور کوئی مستری انجنیئر بن بیٹھے، تو یہ دماغ کا خلل ہی سمجھا جائے گا۔ اگر کوئی تیس مار خاں ہونے کا دعویٰ کرے تو کہلانا تو آسان ہے مگر خلقِ خدا تسلیم نہیں کرے گی۔ فرش پر بیٹھ کر عرش پر چھلانگ مارنے کی کوشش کرے گا تو گر جائیگا۔اپنی اوقات سے بڑھنا بیوقوفی کہلاتی ہے۔پرائے فنکشن میں بغیر دعوت کے ٹوپی سر پہ رکھ کر پہنچ جائے اور فرمائش کرے کاجو کا حلوا کھانے کی تو پتا تب چلے گا جب کوئی گریبان سے پکڑ لے گا۔ مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی ناپ تول اور پیائش کرنا ضروری ہے اور اپنی حد اور اوقات میں رہنا چاہیئے۔یہ اُس کے لیے فائدہ مند ہے۔

کبوتر کتنی ہی بڑی اُڑان اڑلے مگر عقاب بننا مشکل ہے، عُقاب ہی عُقاب ہوتا ہے۔خرگوش چاہے کتنا تیز بھاگ لے پر ہرن بننا مشکل ہے۔ اگر ایسے ہی کوئی ٹھگ میدان میں آئے ، صوفی رنگ کا بڑا چوغہ پہن کر "پہنچا ہوا" پیر بن بیٹھے تو بس بغیر بحث کے مٹھیاں بند کرکے اس سے دور نکلنے کی کریں اور کہتے جائیں "یہاں سب چلتا ہے"۔

ہفتہ وار "پندار" لاہور، 20 تا 26 جنوری 2021۔

بلی بلی میں فرق ہے

پرانے دور میں، غالباً اب بھی، دیہاتی علاقوں میں لوگ جست اور دوسری دھاتوں کے برتن کاندھوں پر اور خاص طور پر گدھوں یا گدھا گاڑیوں اور ریڑھیوں پر لے جا کر بیچتے تھے۔ جہاں وہ نئے برتن بیچتے تھے وہیں پر پرانے برتن کم ریٹ میں خرید بھی لیتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو دور علاقوں سے آئے ہوتے تھے اس لیے رات وہیں پہ گذارتے تھے۔ پہلے گاؤں میں بڑی بیٹھکوں کا رواج ہوتا تھا جہاں پر مسافروں کو کھانے پینے کے ساتھ سونے کے لیے بستر بھی دیا جاتا تھا۔ ان برتن والوں کے ساتھ اکثر بلیاں بھی ہوتی تھیں جو وہیں بسیرا کرتی تھیں اور مہمانوں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں اور ہڈیوں پر قناعت کرتی تھیں۔

آج بھی کافی جگہوں پر ایسے سخی انسانوں کے ہاں بیٹھکیں چلتی ہیں۔ مگر کچھ ان نیک لوگوں کی دائمی زندگی کی طرف منتقلی کے بعد اور کچھ جدیدیت کے اثرات کے باعث ان آستانوں پر پر تالے لگ گئے ہیں۔ اُس کی وجہ یا تو لواحقین اور اپنوں کی آپس میں جائیداد کی تقسیم میں رسہ کشی ہو سکتی ہے یا دوسرا عنصر جو واضع دکھائی دیتا ہے وہ بیٹھکوں کی جگہ پہ ہوٹلوں کا قیام ہے۔ جہاں پر اب دوستوں کی محفلیں جمتی ہیں۔ پہلے بیٹھکوں پر پیر مرید اور گاؤں والے سارے ملکر ایک دوسرے سے دکھ درد بیان کرتے تھے۔ اتنی باہمی محبت ہوتی تھی کہ ایک گاؤں میں ایک ہی بیٹھک کافی سمجھی جاتی تھی جہاں غم اور خوشی کی رسموں سے لیکر معاملات کے فیصلے بھی ہو جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ قریب ہی مسجد اور تعلیم کے لیے ایک کمرہ مولوی صاحب کا بھی ہوتا تھا جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ وقت کی آندھیوں

نے جہاں اور بہت کچھ تباہ و برباد کیا وہیں ہماری محبتوں والا ماحول، رہن سہن اور ثقافت بھی متاثر کی۔ گھروں کو تنگ کرکے ان ہی میں بیٹھک بنانے کا رواج ہو گیا ہے تو ساتھ ہی اُن نیک مردوں کا فی سبیل للہ کھانا پکانے کا نظام بھی ختم ہو گیا۔ جبکہ ماضی میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک بیٹھک پہ سارے گاؤں والوں کے دن مقرر ہوتے تھے یا ہر کوئی اپنا کھانا لیکر آتا تھا۔ ہر ایک گھر سے روٹی مدرسہ میں یتیم اور پردیسی بچوں کے لیے لائی جاتی تھی۔ گھر کی مالکن مہمانوں کے لیے ہر وقت کھانا تیار کرنا اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھی۔ اب مہمان تو دور، بیچارے گھر والوں کو بھی ہوٹلوں کی روٹی کا انتظار ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت بدلا ویسے ویسے غذاؤں کی تبدیلی جہاں معاشرتی بیماریاں لائی، وہیں ایسے ذہنی، روحانی اور جسمانی امراض بھی ظاہر ہوئے جن کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ اصل چلا گیا ہے اور اس کی جگہ نقل نے لے لی ہے۔ اب تو مسکراہٹیں بھی نقلی ہیں۔ سارے رشتے دوستیاں مطلب پر قائم ہیں۔ رہی یہ بلیاں تو جب وہ زمانے کے تغیرات اور اِن برتن بیچنے والوں کی ٹھوکریں برداشت کر گئی ہیں تو اِن کو زمانے کے حاسدین کی ٹھوکریں بھلا کیا کہیں گی؟

ہاں، ایک بات ضرور ذہن نشین کریں، اُس برتن بیچنے والوں کی بلی کی جگہ پر کہیں ہوٹل والی بلی جو کڑاہی کی عادی ہے وہ نکل آئی تو؟ تو بہتر ہے کہ ہر کسی کے گھر اُن برتن بنانے والوں کی طرح مہمان بن کر مت جانا۔ بلی، بلی میں فرق ہوتا ہے، ایسا نہ ہو کہ مٹھیاں بند کرکے بھاگنا پڑے اور کہنا پڑے "سب چلتا ہے"۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 14 جنوری 2021۔

حسد، جلن اور بد ہضمی

اکیسویں صدی جہاں معاشرے میں بہت سی جدتیں لائی ہے، وہاں اس نے اُتنی ہی بد گمانیوں کو بھی جنم دیا ہے، جن کا بڑا سبب حسد اور جلن ہے۔ کسی کی اچھی ادا، بھلے وہ مثبت ہی کیوں نہ ہو دوسرے کا ہاضمہ اسکو برداشت نہیں کرنے دیتا۔ ہمیشہ کینے اور بغض کی ڈکاریں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو بیٹھے بیٹھے زہریلے بچھو کی طرح لفظوں میں زہر ضرور پھیلائے گا۔ اگر ایسا نہ بھی کر سکا تو بھی منہ تو بنائے گا اور ناک ضرور چڑھائے گا۔ حسد اب ہمارے روزمرہ معمولات کا ایک عام جز بن چکا ہے۔ ایک ہوٹل کا مالک اپنے سامنے ایک نئے ہوٹل کو برداشت نہیں کرے گا۔ یہاں تک کے اس کی کوشش ہو گی کہ اس کے آس پاس قریب میں بھی کوئی ہوٹل نہ ہو، تاکہ اس کے گاہک کم نہ ہوں۔ لیکن وہ یہ بُھلا بیٹھتا ہے کہ روزی دینے والا اور روزی میں برکت ڈالنے والا کوئی اور ہے۔ یہ بُھلا کر وہ دوسرے کو نقصان پہچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اگر کچھ نہ بھی کر سکا تب بھی کسی عملیات والے کو تلاش کرے گا۔ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ اس کے بھی بچے ہیں، کوئی روزگار ہے، مگر اپنے نفس کی خواہشات سے مجبور ہو کر اس عمل میں لگ جائے گا۔ ایسے ہی ایک ٹرانسپورٹر، ایک دودھ والا، مسجد کا پیش امام، یا ایک جعلی پیر دوسرے جعلی پیر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیگا کہ گاہکوں میں کمی نہ آئے. ایسے ہی ہمارے ڈاکٹر حضرات دوائیاں تبدیل کر کے لکھیں گے اور ٹیسٹ ضرور دوبارہ کرائیں گے، چاہے

پچھلے ڈاکٹر کی تشخیص اور علاج درست ہی کیوں نہ ہو۔ صرف اپنا گاہک پکا کرنے کے لیے بھی ڈاکٹر مریضوں کو بڑے بڑے لیکچر دیں گے۔ علاج کے بارے میں کم مگر پہلے ڈاکٹر پر تنقید زیادہ۔ اسی طرح کوئی پڑوسی نئی گاڑی خرید لے، یا اچھے کپڑے ہی پہن لے سب سے پہلے اپنے ہی رشتہ دار، پھر گلی محلے اور پھر گاؤں والے اندر ہی اندر جل رہے ہوتے ہیں. ایسے ہی ایک وڈیرا کسی دوسرے نئے وڈیرے کو نیچا دکھانے کے لیے پارٹیاں تبدیل کرنے میں لگا ہوتا ہے اور لیڈروں اور سیاستدانوں کے آگے کوئی بھی غیبت کا موقعہ اور خوشامد کا موقعہ ضایع نہیں کرتا۔ یہ بڑے امراض ہمیں اس جدید دور نے تحفے میں دیے ہیں۔ جب جلن اور حسد حد پار کر لیتے ہیں تو پھر کوئی حل نہیں ملتا۔ سکون اور آرام برباد ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی۔ انسان اندر ہی اندر میں منصوبے بناتا رہتا ہے کہ اپنے مخالف ترقی کرنے والے کو کیسے زیر کرے۔ تب خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ سوچیں اور بیچینیاں امراض میں نہ بدل جائیں۔ پھر شگر اور بلڈ پریشر، اوہام اور عداوتیں اس کو جسمانی اور ذہنی بیماریوں میں جکڑ کر زندگی کا دیا ہی بجھا دیتی ہیں۔ اصل میں یہ سب حربے نقل کو چھپانے کے ناکام طریقے ہیں کہ کہیں اصلیت ظاہر نہ ہو جائے۔ کیوں کہ نفرتوں کے کھائے ہوئے بینگن بد ہضمی تو کریں گے ہی۔ پھر اس کے ساتھ چھپ چھپ کے جھوٹ اور ٹھگی کا پیاز پتوں سمیت کھایا ہوا ہوگا تو وہ سب ملکر بچارے کو حسد اور کینے کی بد ہضمی کا سبب تو ضرور بنیں گے۔ بس اگر اس قسم کے رشتہ دار، دوست، پڑوسی، وڈیرے یا پیر یعنی کوئی ایسے کردار راستے میں مل جائیں تو ان کی سرگوشیاں سننے اور سنانے کے بجائے مٹھیاں زور سے بند کر کے بھاگو اور کہتے جاؤ "یہاں سب چلتا ہے"۔

برتن میں کچھ ہوگا تو نکلے گا

سمندر اسے کہا جاتا ہے جس میں پانی ہو۔ کسی خشک جھیل کو سمندر نہیں کہا جاتا۔ کسی نہر یاشاخ کو دریا کا لقب دینا جہالت سمجھا جائے گا۔ ایسے ہی کسی جاہل کو عالم نہیں کہا جاسکتا ہے، اور کسی ہنر منداور فن جاننے والے کو نکما نہیں کہا جاسکتا۔ بھرے ہوئے گودام اور خالی گودام میں واضح فرق ہوتا ہے۔ بھری ہوئی دیگ سیدھی ہوتی ہے، لیکن جب خالی ہو جاتی ہے تو اسکو اُلٹا کرکے رکھتے ہیں تاکہ کوئی جانور اس میں منہ نہ مار لے۔شادی اور خوشی کی تقریب میں کھانے پینے کا انتظام نہ ہو تو خوشی پھیکی پڑ جائیگی۔ آدمی ہر طرح سے اچھا ہو مگر گفتگو میں سلیقہ اور مٹھاس نہ ہو، بولے تو بکواس محسوس ہونے لگے اور خاموش کرانے کے لیے کسی لاٹھی کی ضرورت پڑے، تو وہ شخص بھی مطلوب نہیں۔ ایسے ہی ایک اچھا استاد وہ ہے جس میں مطلوبہ مہارت ہو۔ خالی برتن میں ہاتھ ڈالوگے تو سوائے گرد اور پرانے جالوں کے کیا ملے گا؟ سیکھنا چاہتے ہو ڈاکٹری اور پڑھنے جاؤ بڑھئی کے پاس تو وہ تمہیں لکڑی جوڑنے اور توڑنے کا فن تو ضرور سکھا دے گا، بہت ہی اچھے دروازے کھڑکیاں اور فرنیچر جوڑنے کے بارے میں اچھی خاصی معلومات تو فراہم کردے گا، مگر ڈاکٹری کے راز سکھا نہیں سکتا۔ کیوں کہ وہ اس کی فیلڈ ہی نہیں۔ اگر سونا خریدنا ہو اور سونے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی لوہار کے پاس جاکر پوچھوگے تو وہ بیچارا پھاوڑوں اور کلہاڑیوں کا تو بتادے گا پر سونا پہچاننے سے معذرت ہی کریگا۔ایسے ہی ڈیری فارمنگ کرنے کے لیے کسی پولٹری فارمنگ والے کے پاس سیکھنے کے لیے جاؤگے تو وہ انڈوں اور چوزوں ہی کی بات کرے گا۔ ٹریکٹر ڈرائیور بیچارا آپکو صرف

گوبل اور ہل چلانے کے رازاور ٹیپ رکاڈر کی آواز سننے کا طریقہ بتائیگا یا پھر اپنے استاد کی تعریف کرے گا لیکن وہ ریل گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسے ہی ایک انجنیئر سے بیماری کا علاج نہیں پوچھا جاسکتا۔ اگر وہ ڈاکٹر کہلانا چاہے تو اسکو صرف عطائی ڈاکٹر ہی کہا جائیگا۔ کوالیفائیڈ اور سرٹیفیکیٹ یافتہ ڈاکٹر نہیں کہلائیگا، اور اس کو کسی چھاپے سے بچنے کے لیے ہمیشہ کچھ غلط ترکیبیں کرنی پڑیں گی۔ علم ایک عالم ہی سے سیکھا جاسکتا ہے۔

ایسے ہی سکون اور راحت صرف سکون اور راحت والوں سے ہی لی جاسکتے ہیں۔

روحانیت اور تصوف بھی ایک الگ علم ہے۔ یہ علم بھی صرف اور صرف اسی کے ماہرین ہی سے سیکھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ کسی کے پاس برتن میں جو کچھ ہوگا وہی آپکو دیگا۔ ہر دکان والا اپنا ہی سامان بیچتا ہے۔ گویا ہر فن کے لیے استاد کی اور اسی فن کے استاد کی ضرورت ہے۔ بغیر استاد، شیطان کا شاگرد ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا عطائی اور جگاڑی استادوں سے دُور رہو۔ ایسے عطائی ماہروں سے زور سے مٹھیاں بند کرکے بھاگنے کی کرو اور کہتے جاؤ کہ اس معاشرے میں ایسے ہی "سب چلتا ہے"۔

روزنامہ "نوائے انصاف" ملتان، جمعۃ المبارک 1 جنوری 2021۔
روزنامہ "پیش رفت" لاہور، جمعۃ المبارک 1 جنوری 2021۔

دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

خوشامد، چاپلوسی یا چمچہ گیری کوئی نیا فن نہیں۔ بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں قصیدہ گوئی نے توپرانے وقتوں میں ہی ایک اعلی فن کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ خوشامد پسندی شائد انسانی فطرت میں ہے۔ کیونکہ آج بھی خوشامدی لوگ ہر میدان میں اپنے فن کے جوہر دکھاتے نظرآتے ہیں۔ موجودہ وقت کے حکمرانوں کے آگے وزیروں کی وقتاً فوقتاً موقع کی مناسبت سے خوشامد یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ رواج آج بھی رائج ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اب نئے اور جدید طریقے استعمال کرکے اپنی اہمیت بڑھائی جاتی ہے۔آفس سے لے کر بیٹھک تک، ہر لیڈر اور ہر وڈیرے کے آگے ایسے ہی بے شمار خوشامدیوں کے جھرمٹ لگے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اب تو فیس بک بھی اسی کام کے لیے بہت استعمال ہو رہا ہے۔ ہر اہم شخص کی تعریفیں اور اس کے ساتھ سیلفیاں۔ لوگ تعریفوں کے پل ایسے باندھ رہے ہونگے کہ موصوف خود شرمندہ ہو رہا ہوگا کہ ایسی خوبیاں کیا واقعی مجھ میں ہیں؟

ایسا بھی نہیں ہے کے پورا جہان گیدڑ کھا گئے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ گیدڑوں کو بھگانے والے وفادار کتوں میں ضرور کمی آئی ہے۔ ان کی جگہ بھیڑیوں نے لے لی ہے جو ہر نمونے اور رنگ میں ظاہر ہوگئے ہیں۔ ان کی عادتیں اور وارداتیں بھی ایک جیسی ہیں صرف جسامت کے لحاظ سے فرق ہے۔ رنگ روپ بھی انسانوں کی طرح ہے۔ سورج تو اب بھی طلوع اور غروب ہو رہا ہے۔ بیشک! مگر آنکھوں کے دیکھنے میں فرق ضرور آگیا ہے۔ سورج کے سامنے نہ ختم ہونے والی نفرتوں اور عداوتوں کے کالے بادل چھا گئے

ہیں۔ ذہنی موسموں کی تبدیلی نے بھی رنگ دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ پیشنگوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی وفائیں اور وفاداریاں، محبتیں اور حیا موجود ہیں۔ انسان دوست، خداترس، حیااور شرم کے رکھوالے اور بااخلاق افراد ہر فیلڈ میں میسر ہیں۔ تب ہی تو کار خانۂ قدرت چل رہا ہے۔ پر اب سچے لوگ بے بس ہو کر خوشامدی ٹولوں کے سامنے سر جھکا کر اپنے ضمیر کی وجہ سے خاموش ہو جاتے ہیں یا مصلحت پسندی کا شکار ہو کر خاموشی میں عافیت سمجھ کر گردن ہلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دودھ تو آج بھی جانور سفید ہی دیتے ہیں پر اب اس میں ملاوٹ کی جاتی ہے ورنہ جانور کی خوراک کے پیسے بھی نہیں بچتے۔ پرانے وقتوں کے بادشاہ تو مان جاتے تھے پر آجکل کے حاکم بہت ہوشیار اور سمجھدار ہو گئے ہیں۔ آجکل دوست یار غرضیکہ ہر چھوٹا بڑا دوسرے کو پھنسانے کے چکر میں مصروف ہے۔ اسی طرح باطن میں کلہاڑیاں اور چھریاں تیز کرنے والے ملتے وقت دوستی، اپنائیت اور محبت کا احساس دلاتے ہیں۔ جب ایسے چہرے سامنے آئیں تو ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے کہ یہ کتے نہ رہیں نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔

روزنامہ ”پروان“ منگل 29 دسمبر 2020۔

تماشے پے تماشا

اصل تماشہ باز تو وہی ہوتا ہے جس کا تماشہ برپا کرنے میں کلیدی کردار ہوتا ہے، اگرچہ وکٹری کا نشان کسی اور آدمی کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ عموماً ناچنے والے، نچانے والوں کے محتاج تو ہوا کرتے ہیں لیکن حصے دار ہرگز نہیں۔ چوکیدار تنخواہ تو ضرور لیتا ہے لیکن جن چیزوں کی چوکیداری کرتا ہے اس کا حصہ دار نہیں بنتا۔ وزن اٹھانے والا کرایہ تو لیتا ہے لیکن وزن اور سامان کا مالک نہیں ہوتا۔ کرائے دار مکان میں رہتا تو ہے لیکن ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ سواری پر بیٹھنے سے منزل تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے لیکن آپ سواری کے مالک نہیں بن جاتے۔ ہوٹل میں کھانا کھانے سے ہوٹل کا مالک نہیں بن سکتے۔ حسن اور صورت اچھی سیرت کی ضامن نہیں۔ پوشیدہ باتیں سن لینا ایک بات ہے اور ان کی تہ تک پہنچنا اور بات ہے۔ دعوے اور اور کارکردگی میں فرق ہے۔۔ موسمی لیڈر سچ مچ لیڈر بن نہیں جاتے۔ ایسے ہی وبائی مرض کچھ نقصان تو دے سکتا ہے لیکن ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ ہر صاحبِ دولت حقیقتاً امیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر غریب فقیر نہیں بنتا۔ ہر سیاستدان کی اولاد سیاست تو کرتی ہے لیکن نام اور مقبولیت کسی کسی کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر بننے کے لئے ڈاکٹر کے بیٹے کو بھی پیشہ ورانہ تعلیم ضروری ہے۔ اچھی پیکنگ نقلی اشیاء کی اصلیت کو چھپا نہیں سکتی۔ وفادار پس تو جاتا ہے لیکن بے وفا نہیں ہو سکتا۔ ناشکرا تو بے صبر ہو جاتا ہے لیکن نعمتوں والے نخرے نہیں کرتے۔ ہر فقیر، پیر کہلا تو سکتا ہے لیکن وقت آنے پر ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ عشق کو فقط خوشبو سے ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ ہر بات پر ہاں کہنے والا فقط وقت کے انتظار میں رہتا ہے۔ ایک مداری بندر سے کمائی تو کر سکتا ہے لیکن خود بندر نہیں بن سکتا۔ بس ایسے کرداروں سے ہی معاشرے میں سب کچھ چلتا ہے۔

روزنامہ "ایمان" بدھ 23 دسمبر 2020۔ ہفتہ وار "پندار" لاهور، 23 تا 29 دسمبر 2020۔
روزنامہ "شال"، "پروان"، "پیش رفت"، "نوائے انصاف" ملتان، جمعرات 24 دسمبر 2020۔

پکا مٹکا محبت کا

دوستو! پرانے وقت میں دریاؤں پر پل نہیں ہوتے تھے، اور دریا کے رخ اور راستے بھی وقت، موسم اور ان کی موج مستی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ اس وقت کے لوگ کشتیاں استعمال کرتے تھے۔ اکیلا آدمی ایمرجنسی میں تیرنے کے لیئے پکا مٹکا استعمال کرتا تھا جیسے آجکل کے لوگ شوقیہ طور پر ٹائر اور ٹیوب وغیرہ پر تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سندھ کی مشہور لوک داستان سہنی مہینھوال کے واقعات آپ نے سنے ہونگے، سہنی مہینھوال کے عشق میں ایک مٹکے پر تیر کر دریا پار جاتی تھی۔ لیکن ایک دن اس کی حاسد سہیلیوں نے پکے مٹکے کی جگہ کچا مٹکا رکھ کر اس سے دھوکا دیا۔ بارشوں کی ایک تاریک رات میں جب دریا اپنی پوری طغیانی میں تھا تو وہ بیچاری اپنی سہیلیوں کی سازش کے نتیجے میں ڈوب گئی۔ اس کا قصور بس یہ تھا کہ وہ ہوش میں نہیں تھی اور کچے اور پکے کا فرق نہیں جان پائی۔ دوستو، شاہ بھٹائی فرماتے ہیں کہ،

کارِي رات ڳچو گهڙو
جا گِهڙي وسندي مينهَن.
هَلو تہ پُڇئون سهڻِي،
جا ڪرِ جاڻي نينهَن.
جنهنڪي راتو ڏينهَن،
ميهارُ ئي مَنَ ۾.

وہ اپنی محبت اور عشق میں سب کچھ بھول گئی۔ اس کے اندر فقط ایک میھار کی جستجو تھی۔

دوستو، یہ دنیا بھی ایک دریا کی مانند ہے۔ دنیا کی آخری تیراکی قبر اور برزخ میں ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو فطری طور پر وہ دنیا میں رہنے کے طریقے ایک دوسرے سے سیکھ لیتا ہے۔

اب آپ غور کریں کہ اگر آپ نے فقط دنیا کی خواہشات کو اپنا میعار سمجھ کر یہ نہیں پہچانا کہ کونسی خواہشیں سچی اور پکی ہیں، اور کون سی کچی ہیں اور اس آخری تیراکی کے وقت آپ کی سہیلیوں یعنی نفسانی خواہشات اور شیطانی وسواس نے آپ سے دھوکا کیا تو قبر اور برزخ میں آپ سراسر گھاٹے میں جاؤگے۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ تیراکی سیکھ لیں اور اپنی سہیلیوں کو پہچان لیں۔ دھوکے اور فریب سے بچیں۔ اگر آپ کا عشق حق کیطرف کھینچتا ہے تو سمجھو آپ دونوں طرف کامیاب اور سرخرو ہو گئے۔ کیونکہ یہ دنیا اور سارا جہان فانی ہیں۔ ایک نہ ایک دن غوطہ لگانا پڑے گا۔ تو مٹکا پکا ہی استعمال کریں۔ عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پکا مٹکا ہے بشرطیکہ اس کو درود پاک کی کثرت کی بھٹی میں اچھی طرح پکا لیا جائے۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 17 دسمبر 2020۔

روزنامہ "شال"، کوئٹہ، جمعہ 18 دسمبر 2020۔

ظاہریت کی نمائش

دوستو! دنیا آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنے کی عادی ہے، اس لئے ہمارا معاشرہ اس کوشش میں ہوتا ہے کہ ہر طرح اپنے ظاہر کو صاف ستھرا بنا کر رکھے۔ ایک مرتبہ وتایو فقیر اپنے فقیروں والے لباس میں کہیں دعوت کھانے نکل گیا۔ جب وہاں دعوت میں پہنچا تو میزبانوں نے اُسے ایک فقیر اور غریب جان کر باہر بٹھا دیا اور کوئی توجہ نہ دی۔ فقیر کو حیرت ہوئی۔ وہ اپنے کسی معتقد کے پاس گیا۔ اس سے اچھا سا لباس لیا اور سواری کے لئے گھوڑا لیکر پھر سے اس دعوت میں واپس آگیا۔ میزبان وتایو فقیر پہ فدا ہو کر سوچ میں پڑ گئے کہ اُسے کہا ں بٹھائیں اور سب مخصوص خوان فقیر کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ فقیر نے ان سب کھانوں کی طرف اشارہ کرکے اپنے کپڑوں کو کہا آپ یہ کھائیں اور گھوڑا بھی کھائے۔ میزبان پریشان ہو گئے۔ یہ کیسا مہمان آیا ہے۔ فقیر نے کہا اگر میری ذات کے لئے یہ سب کچھ ہوتا تو پہلے ہی ہوتا۔ یہ سب کچھ ان کپڑوں اور سواری کے بنا پر ہے تو کھانے کا حق بھی ان کو ہے۔ وتایو فقیر نے اپنے مزاحیہ انداز میں بڑی بات کر دی۔ واقعتاً آجکل اچھی پیکنگ ہی بکتی ہے۔ لوگ ظاہری چمک دمک دیکھ کر چیز خرید لیتے ہیں۔ کھانے کی روزمرہ کی اشیاء سے لیکر رشتے داری، دوستی، سب ظاہری مناصب دیکھ کر کرتے ہیں۔ ہم ظاہر کو ترجیح دیتے ہیں اور پھر دھوکہ کھا کر پچھتاتے رہتے ہیں۔ مگر وقت ہاتھوں سے نکل چکا ہوتا ہے۔

دوستو! اسی طرح، روحانیت روح سے منسلک ایک نایاب چیز ہے۔ جو اصل اور نقل کی پہچان کرانے میں مددگار ثابت ہوا کرتی ہے۔ اس وقت روحانیت بھی دوسری اشیاء کی طرح دھوکہ آمیز پیکنگ میں دکانوں پر بیچی جارہی ہے۔ خبردار دھوکہ مت کھائیں۔ اصلیت چھپتی نہیں ہے لیکن دیر ضرور لگتی ہے۔ ڈھونڈنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ سچے موتی عام نہیں ملتے، سمندر کی تہہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ مشک ہر ایک ہرن کی ناف میں نہیں ہوتا۔ سب بادام میٹھے نہیں ہوتے۔ ہر پھول خوشبودار نہیں ہوتا۔ ہنس پرندے نایاب ہوتے ہیں، سارے پرندے ہنس نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائے۔

روزنامہ "پروان" جمعتہ المبارک 11 دسمبر 2020۔

جہادِ زندگی

دوستو! زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور جنگ کا نام ہے۔ بچہ جب تک روتا نہیں تو ماں اسے دودھ نہیں دیتی۔ یہیں سے ہی انسان کی زندگی میں ایک قسم کی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد خاندان میں اپنے بھائی بہنوں سے آگے نکلنے کی جدوجہد، تعلیم کے میدان میں سرخرو ہونے کی جدوجہد، پڑوسیوں اور رشتے داروں میں زیادہ عزت حاصل کرنے کی جدوجہد، سیاست، کاروبار، دفتر غرضیکہ ہر جگہ پر ہمیں کسی نہ کسی قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بلکل ایسے ہی ایک صوفی اپنے نفس سے جنگ کا آغاز کرتا ہے، اور اس کو فرمانبردار بنانے کہ لیے ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد شروع کرتا ہے، جو زندگی کہ آخری لمحات تک جاری رہتی ہے، اور اس کا اختتام روح کے پرواز کر جانے پر ہوتا ہے۔ کبھی اپنے استاد کی شاگردی میں مصلحت پسندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ جیسے ایک بیمار صحت حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے پرہیز والی مصلحت کرتا ہے، یا کبھی کوئی سیٹھ اپنے قرض کی وصولی کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی قرض دار سے مصلحت پسندی کرتا ہے۔ سیاستدان الیکشن کے نزدیک ووٹر کے ناقابلِ برداشت رویے پر بھی کچھ وقت کے لیے مصلحت پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک قابل استاد اپنے نئے شاگرد کو اپنا فکری پیروکار بنانے کے لیے شروعات میں ایسے ہی مصلحت پسندی کرتا ہے جیسے ماں باپ اپنے بچے کو اسکول کی عادت ڈالنے کہ لیے چاکلیٹ اور ٹافیوں کے ذریعے مصلحت پسندی کرتے ہیں۔ بہر حال زندگی دکھوں اور خوشیوں کے درمیان ایک جدوجہد ہے جس سے کوئی بھی انسان کسی صورت بھی نہیں بچ سکتا۔ صوفی ایک باعلم جنگجو ہوتا ہے، جو دن رات اپنے وجود اور نفس سے جہاد میں مشغول رہتا ہے۔ اب اگر وہ بغیر ہتھیاروں کے ہوگا تو اس کے ہارنے کا اندیشہ رہے گا۔ اور اگر ہتھیار بند ہوگا تو فتح آسان ہوجائے گی۔ ہمارے پاس درود شریف پڑھنے کا ایک ہتھیار موجود ہے، جس کی موجودگی میں ہارنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگرچہ کبھی کچھ مصلحت پسندی بھی کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اللہ پاک آپکا اور ہمارا نگہبان، حامی اور ناصر ہو۔

مقامِ عشق

دوستو! کبھی کبھی آپ نے بچوں کو دیکھا ہوگا وہ نئے نئے کھلونوں کو توڑ کر جوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سارا وقت اس کام میں مشغول رہتے ہیں۔ جب تک یا تو کھلونا بالکل کام سے نہ جائے یا دھیان کسی دوسری طرف ہو جائے۔ اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بھی کوئی مستری کسی دیوار کا پلستر کرتا ہے تو پہلے موجود پلستر کو رگڑ ضرور دیتا ہے۔ اس کو کٹ لگانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اگر دیوار نئی ہے تو اس کی اینٹوں کو پانی سے سیراب کرواتا ہے۔ ان کے بیچ میں اگر مٹی ہے تو اس کو نکالتا ہے۔ اگر سیمنٹ ہے تو اس کی رگڑائی ہوتی ہے۔ بغیر رگڑائی پلستر جم نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر آئل پینٹ بھی کروانا ہے تو پہلے والا رنگ اتارا جائے گا اور اگر پہلی بار ہے تو سیمنٹ میں رگڑائی لازمی ہے۔ اسی طرح حکیم صاحبان پہلی کھائی ہوئی دوائی کا اثر جلابوں کے ساتھ ضائع کرا کر نئی دوائی کھلاتے ہیں تب ہی وہ اثر بھی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ان پڑھ بچے کو علم حاصل کرنے کے لیے الف سے یعنی صفر (زیرو) سے اسٹارٹ کروایا جاتا ہے۔ اسی بچے کی طرح ایک کامل استاد پہلے معرفتِ الٰہی کے طالب کی نفسانی خواہشات کو زائل کرواتا ہے۔ اس کے پرانے خیالات اور خواہشات کو توڑ مروڑ کر ان میں سے سارا ٹیڑھا پن نکال کر نئے سرے سے اس کی ذہنی و جسمانی سیٹنگ کرتا ہے جیسے ایک مستری بورنگ سے پہلے زیر زمین پانی نکالنے کے لیئے پانی استعمال کرواتا ہے۔ دوستو، ایسے ہی ایک صوفی استاد درود پاک کی کثرت سے اندر کی گندگی کو دھلاتا ہے، پھر اس کو ذکر قلبی سے رندا لگا کر اندرونی صفائی کرواتا ہے۔ مثلاً صبر برداشت سکھا کر اور غصہ، حسد، کینہ، بغض نکال کر۔ جب وہ طالب کسی قابل ہو جاتا ہے تو اس کو رمز کی باتیں سمجھ میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ کشف کی صورت میں حجاب کے پردے دور ہونے لگتے ہیں۔ ایک خاموشی کا سماں باندھ دیا جاتا ہے۔ سب کچھ جان کر بھی وہ بے خبر ہو جاتا ہے۔ رضائے الٰہی پہ راضی رہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے مقامِ عشق کہا جاتا ہے۔

روزنامہ "شال"، کوئٹہ، منگل 9 دسمبر 2020۔

حقیقتِ زندگی

دوستو! آپ نے کرکٹ کا بال تو دیکھا ہوگا جس سے بچے اور بڑے کھیلتے ہیں۔جب یہ نیا خریدا جاتا ہے تو اسے بڑے شوق سے سنبھال کر رکھا جاتا ہے، مگر جب اس کے ساتھ کھیل کھیلا جاتا ہے تب اس کا حشر نشر ہونے لگتا ہے۔ جب باؤلر اسکو بلے باز کی طرف پھینکتا ہے تو بلے باز بے رحمی کے ساتھ اس کو بیٹ کے ساتھ ایسا شاٹ لگاتا ہے کہ وہ تیزی سے میدان سے باہر جا گرتا ہے۔ ہر طرف سے تالیوں کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تماشائی بڑے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی نے اس بال سے پوچھا ہے کہ آپ کو کتنے زور سے مارا گیا ہے؟ وہ چاروں اطراف ادھر سے ادھر مار کھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کی کھال بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ناکارہ ہو کر غریب بچوں کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے۔ وہ اس کو جوڑ توڑ کر پھر سے مار اماری کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔

ایک انسان بھی اس بال کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اولاد کی نعمت ملنے کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسکی بڑی دیکھ بھال شروع کی جاتی ہے۔ پھر جب وہ نرسری کے لئے تیار ہوتا ہے تو اس کے اوپر کتابوں کا ایک بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ نانی اماں اس کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے تو دادی اماں اس کو انجنیئر دیکھنا چاہتی ہے۔ ابو اس کو باہر ملک بھیجنے کے لئے پیسے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بیچارہ بچہ ان سب باتوں سے بے نیاز دن بہ دن بڑھتا اور درسی کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا رہتا ہے۔ اگر وہ گھر میں کوئی غصہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے تو امی اس کو ٹی وی پر کارٹون لگا کر خود سہیلیوں میں مگن ہو جاتی ہے۔ ابو ڈیوٹی سے واپس گھر آتے ہیں تو وہ پیار لینے کے لئے ابو کو چمٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ ابو فون پر گیم سیٹ کرکے اس کے ہاتھوں میں تھما کر اپنے کام اور دوستوں سے گپ شپ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بے رحم وقت بغیر کسی کا انتظار کیے گذرتا جاتا ہے۔ وہ بچہ اسکول سے کالج، پھر مارکس کی دوڑ میں نانی دادی کی خواہشات کے پیچھے چل پڑتا ہے، حتیٰ کہ یونیورسٹی میں پہنچ جاتا ہے جہاں سوسائٹی ایک اور طرح کی ملتی ہے۔ مختلف صحبتیں

نصیب ہوتی ہیں۔ اچھے برے دوست ملتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد ایک طرف شریکِ حیات کی خواہشات اور اولاد کی جستجو، دوسری طرف والدین کی خواہشات۔ وہ دونوں کے بیچ میں ایک بال کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑتا رہتا ہے۔ اس میچ کے بعد ایک اور میچ کے لیے پھر سے انسولیشن ٹیپ لگا کر گراؤنڈ میں بھیجا جاتا ہے۔ آنے والی نسل کی پرورش، بیوی بچوں کی خواہشات اور دفتر اور کاروباری چکروں میں پھر سے گراؤنڈ کے چاروں کونوں کی طرف مار کھا کر کبھی تماشائیوں کی داد واہ، کبھی موجود افراد کے قہقہوں کی گونج، تو کبھی رنج والم سے کیچ چھوٹنے پر (یعنی بیوی بچوں کی خواہشات پوری نہ ہونے کی صورت میں) زمین پر زور سے پیر مار کر غصہ ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ وہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اسی بھاگ دوڑ میں جب وہ ناکارہ ہو جاتا ہے یعنی پنشن تک پہنچتا ہے، اس کے اعضاء بھی اس بال کی طرح ناکارہ ہو جاتے ہیں تب اسکو اکیلے حج پر بھیج دیا جاتا ہے یا تبلیغ پر۔ یا پھر گھر کے کسی کونے میں، یا اولڈ ہوم میں بالکل اس پھٹے بال کی طرح ہی کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اس انسان کے لیے ہیں جو اس دنیا کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس دنیا کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہ حشر نشر ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ کبھی بھی اس بال سے کسی نے کوئی شکایت نہیں سنی۔

صوفیاء کرام دنیا میں اور انسانوں کے درمیان بال بننا پسند کرتے ہیں۔ کسی کے کام آنے پر ان کو مزا آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تڑوا کر دوسروں کو تالیاں بجانے پر اکساتے ہیں اور خوشیاں بانٹتے ہیں۔ ایک اچھے صوفی کی مثال ایسی ہی ہونی چاہیے۔ وہ خاموشی کے ساتھ خوشی اور غمی میں صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

دوستو! یہ فرق ہے ایک عام دنیاوی انسان اور ایک صوفی میں۔ اب آپ کی مرضی۔ ناکارہ تو دونوں صورتوں میں ہونا ہی ہے۔ آپ کس طرح اپنے آپ کو رکھتے ہیں یہ آپ پر منحصر ہے۔

روزنامہ "پروان" منگل 8 دسمبر 2020۔

روزنامہ "سنوائی" منگل 8 دسمبر 2020۔

فلسفہء نفس

دوستو! یہ باتیں فقر اور فکر کی ہیں، ان میں سلوک کے رموز اور اشارے چھپے ہوئے ہیں۔ دیکھو! ہم کسی بھی شعبے میں اپنے آپ کو منوانے کے لیے بڑے جتن کرتے ہیں۔ میں اس وقت بات اپنے شعبے کی کروں گا یعنی روحانیت کی۔ ایک حقیر سا طالب علم ہونے کے ناطے۔ دوستو! ہمیں اگر تھوڑی سی روحانی خوشبو آتی ہے تو ہم اِترا جاتے ہیں، اور دوستوں پر فوقیت حاصل کرنے کے بڑے سہانے خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کہ ہماری عزت ہو گی۔ معاشرے میں ہمارا نام ہوگا اور دوست ہمیں بڑی ہستی سمجھیں گے۔ لیکن آپ نے دیکھا نہیں۔ دنیا میں کتنی بڑی ہستیاں ہو کر گذر چکی ہیں، جن کے بڑے بڑے اقوال تھے۔ کرامتیں کہانیاں تھیں۔ آج وہ منوں مٹی کے نیچے اپنے خالق کے پاس آرام فرما ہیں۔ ہماری گنہگار آنکھیں انہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ یہی انجام ہے دنیا کا جس میں اپنے آپ کو بزرگ ثابت کرنے کے لیے آپ بھاگ دوڑ کرتے ہو۔ میرے دوستو! ہمارا سلسلہ مختلف ہے، ہم نمائشی نہیں ہیں۔ نمود و نمائش کے طالب دنیا کے بھکاری ہیں۔ ان کو یہ چیزیں بھاتی ہیں۔ ہماری منزل اور ہے۔ ہمیں سرخرو کسی اور کے سامنے ہونا ہے۔

دوستو! دیکھو، آج کی سائنس نے بھی ثابت کیا ہے کہ ایک کتے سے وہ چور بھی پکڑواتے ہیں اور منشیات اور دیگر ممنوعہ اشیاء بھی۔ ابھی شاید کرونا کے مریض بھی کتوں سے پکڑوائے جائیں۔ دوستو، ہمارے پاس بھی ایک کتا بڑے کام کا ہے، صوفیائے کرام اس کو نفس کہتے ہیں، آئیں ہم اس کی تربیت کریں، اور اپنے قابو میں لا کر اپنی اور معاشرے کی تمام بداعمالیوں کو ختم کریں۔

اللہ ہم سب کا حامی اور مددگار ہو۔

فطرتِ انسان

قانون فطرت ہے کہ، دن کے بعد رات آتی ہے۔ زندگی کے بعد موت کا آنا لازمی ہیں چاہے صحت کا کتنا ہی خیال رکھا جائے۔ ہر ممکن کوشش کی جائے۔ سارے طریقے استعمال میں لائے جائیں۔ مصنوعی ذریعے اور وسیلے استعمال کیے جائیں۔ مگر حکم الٰہی یہ ہے کہ ہر جاندار چیز کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ ایسے ہی جوانی کو کتنا بھی روکا جائے بوڑھا تو آخر کار ہونا ہی ہے۔ امیری غریبی، غمی اور خوشی، دکھ اور سکھ، یہ سب زندگی کی خوبصورتی ہے۔ تپش اور ٹھنڈک کا اثر تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان تربیت یافتہ ہے تو فکر نہیں۔ مشکل حالات کے لیے وہ پہلے سے تیار ہے۔ ایسے ہی قحط اور خوشحالی، بنجر زمین کا زرخیز، اور زرخیز زمین کا بنجر ہو جانا، سب فطری امور ہیں۔ جیسے سمندر خشکی کو نگل کر اپنے اندر سمالیتا ہے، ایسے ہی کبھی کبھی سمندر بھی خشک ہو جاتا ہے۔ یہ سارا مفہوم سورۃ الرّحمٰن میں درج ہے۔ اس قادر مطلق کے فیصلوں کے آگے کون آئے۔ صرف دعا ایک وسیلہ ہے۔ اور اللہ کے محبوب ﷺ کی بتائی ہوئی سیرت ایک پناہ گاہ ہے۔ تو حاصل بحث یہ ہے کہ ہر میدان میں دنیا تضادات کا مجموعہ ہے۔

یہی چیز آپ کو روحانیت کے میدان میں بھی ملے گی۔ اولیاء کے ساتھ ساتھ آپ کو کچھ نام نہاد، نقلی، جگاڑی افراد بھی ملیں گے۔ وہ منہ کے ایسے پکے ہونگے کہ سچوں کو ابوجہل کہیں گے اور خود اس کے سچے عاشق اور شاگرد ہونگے۔ فقط ظاہری پیکنگ میں کمزور ذہنوں کو دھوکہ دینے کے لیے سب حربے استعمال کریں گے۔ ذہنی اندھیرا کیوں نہ ہو جب سوچنے کی طاقت کو جان بوجھ کر کمزور یا بالکل مفلوج کر دیا گیا ہو۔ خاص طور پر بے

سمجھ اور بے شعور طبقے کو اپنا زر خرید غلام اور مرید بنانے کے لیے شعبدہ بازیاں اور مداری والے کھیل اور فریب استعمال کر کے مقرر شدہ چاپلوسوں کی مدد سے آدھا آدھا بانٹنے کے اصول پر ہر کاروبار میں ایسے فراڈ کیے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک مافیا کے روپ میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اللہ پاک ایک خاص مصلحت کے تحت ان کے توڑ کے لیے سائیں مہر علی گولڑہ شریف کے روپ میں، کبھی بھٹائی سرکار کے روپ میں روحانیت کی ایسی وضاحتیں اور تشریحات کراتے ہیں کہ وہ فراڈیے پھر انہیں بزرگوں کے اشعار ادھار لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر کہیں امام احمد ربانی رح کی اولاد میں سے سچل فاروقی نمودار ہو جاتے ہیں جو بڑی مقصد کی بات کر جاتے ہیں یا پھر داتا سائیں اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایسے کردار آ جاتے ہیں جنہوں نے سچ کہنا سکھایا۔ حسینی راہ کی نمائندگی کرتے ہوئے جھوٹ کو دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ اگر ہمیں حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرح کے شہید عنایت کر رہی ہے تو جھوٹ فریب اور تہمتوں میں پھنسائے ہوئے بلاول مخدوم بھی ہمارے لیے ایک مثال ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی کو حق کے ہتھیار کے ساتھ باطل کو پاش پاش کرتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ سب میرے مالک کے راز ہیں۔ تعلیماتِ محمدی ﷺ کے بغیر کچھ حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ انتیس راتیں چور کی تیسویں ایک رات مالک کی آنی ہے۔ جب کوئی ایسا اندھیرا سامنے دیکھو تو وہاں سے مٹھیاں بند کر کے بھاگنے کی کرو۔

روزنامہ "نوائے انصاف" ملتان، بدھ 2 دسمبر 2020۔

روزنامہ "پیش رفت" لاہور، بدھ 2 دسمبر 2020۔

معاشرتی سبیلیں

دوستو! قدرتی بات ہے کہ اگر انسان ایسی سبیلوں کی مثل بن جائے جو گرمی میں مسافروں کے لیے ٹھنڈا پانی صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے مہیا کرتی ہیں تو معاشرے میں پانی کی گرمی اور تپش کے مارے لوگ ضرور اپنی پیاس مٹانے کے لیے ان سبیلوں کے پاس آئیں گے۔ سبیلوں کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔ آج لوگ صوفیاء کرام کے مزارات اور ان کی تعلیمات کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ دوستو وہ اصل میں ایسی ٹھنڈک پہنچانے والی شخصیات تھیں جو اپنے معاشرے کے ارد گرد تنگ اور پریشان لوگوں کو اچھی طرح جان کر، سمجھ کر ان کو بھٹکنے سے اور معاشرتی خودکشی سے روکتی تھیں۔ اور حقائق بیان کر کے انکو یہ تربیت دیتی تھیں کہ وقت تو گزر جاتا ہے لیکن فکر اور فلسفہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جاہلانہ خیالات، تصورات اور نقلی دنیاوی باتوں سے دور رہنے کا سلیقہ سیکھ جاتے تھے۔ یقینا یہ راستے ان کو اپنے استاد کی تعلیمات سے ملتے تھے۔ یہ شخصیات اپنے مرشد کے جانے کے بعد جانشینی کے چکروں کو چھوڑ کر فقط خالق حقیقی، اپنے مالک کو منانے کے لیے، اس کو راضی کرنے کے لیے، اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے لوگوں کو نوازتی تھیں۔ کوئی دنیاوی لالچ نہیں رکھتی تھیں۔ تو دنیا آج بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ لال شہباز قلندر رحمتہ اللہ ہو، غوث بہاء الدین زکریا ملتانی ہو، داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہو یا خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہو۔ انکے بعد بھی اچھے لوگ آتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ایسی سبیلیں سرگرم رہیں گی۔ فقط ہمیں دیکھنا ہے کہ کوئی ایسی سبیلیں اپنے گھر کی مشینیں اور فرج وغیرہ تو نہیں بن گئی ہیں جو فقط اپنے آپ اور اپنے خاندان تک محدود ہو کے رہ گئی ہوں؟ اور انہوں نے فی گلاس پچاس روپے میں دینا تو ذریعہ معاش نہیں بنا لیا؟ وہ سبیلیں کہیں جعلی طور پر قطب تو نہیں بن رہی ہیں؟ اگر ایسا محسوس ہو تو سمجھ لینا اس میں ان بزرگ ہستیوں کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو وحدانیت اور رسالت پہ یقین رکھنے والے لوگ تھے، انہوں نے کبھی عاجزی کو نہیں چھوڑا۔ نہ ہی اپنے آپ کو خدا تسلیم کروایا۔ ان تعلیمات کے توسط سے فقط خدائے واحد کے راستے پر لگوایا۔ بس سوچیں اور ایسی سبیلیں تلاش کریں۔ آپ کبھی بھی معاشرتی الجھنوں میں آ کر خودکشیاں نہیں کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

روزنامہ "پروان" منگل 1 دسمبر 2020۔

تفسیرِ عشق

اس دنیا میں آپ کو ایسے کئی اشخاص ملیں گے جو دفاتر میں بڑے بڑے مناصب پہ فائض ہونگے۔ سوٹڈ بوٹڈ، ٹائی لگائے ہوئے، زندگی کی گہما گہمی میں مصروف نظر آئیں گے۔ مگر ان کے دل قلندریت والے ہونگے۔ جب ان سے آپکا واسطہ پڑیگا تب آپ کو ایک اور ہی دنیا نظر آئیگی۔ آپ محسوس کریں گے کہ وہ عام لوگ نہیں ہیں۔ یہ مصروفیات بس ان کا ذریعہ معاش ہیں۔ مگر یہ لوگ اور ان کے قلب کسی اور قلب کے زیر نگرانی پرورش پا رہے ہیں۔ ان کی ظاہری اور باطنی کیفیات میں دن رات کا فرق پایا جائے گا۔ ایسے لوگوں کو اگر تم پاؤ تو ان سے ادب سے ملنا اور ان کی کیفیات کی قدر کرنا۔ ان کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ فضول قسم کی باتوں سے گریز کرنا۔

عشق کی باتیں ہمیں عام سنائی دیتی ہیں۔ سب لوگ ہی عشق کرتے ہیں۔ کوئی کسی کی سیرت سے، کوئی کسی کی صورت سے، کوئی کسی کے مال اور جائیداد سے، کوئی کسی کے منصب سے، تو کوئی اولاد وغیرہ سے۔ یہ سب رسم ورواج دنیاوی، عارضی اور ظاہری ہیں۔ دنیا میں ایک قسم ان صوفیاء کرام کی بھی ہے جو عشق کی باتیں اپنی تقریروں میں، اشعار میں، یا نثر کے ذریعے قلم سے کرتے ہیں۔ مگر ان کی باتوں میں فرق نمایاں ہے۔ خاص کر وہ لوگ جن کا اندازِ فکر قلندری ہے ان کے کردار اور طور طریقے میں ایک عجیب سی ہلچل دکھائی دیتی ہے۔ ان کی حرکات کچھ تو جذب کی حالت میں ہوتی ہیں تو بعض مکاشفات کی صورت میں۔ قلندرانہ سوچ کے حامل شمس تبریز کی تعلیمات سے متاثر ایک فقیر سے کسی نے پوچھا کہ فقیر سائیں ہمیں ذرا بتاؤ عشق کی تفسیر کیا ہے؟ فقیر نے غور سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا، "بیٹے! عشق کی تفسیر ایک عشق کرنے والا ہی جان سکتا ہے"۔ وہ رومی ہو یا لال شہباز قلندر، ڈاکٹر علامہ اقبال ہو یا خواجہ معین چشتی! یا آپ کے اساتذہ بابا سائیں احمد علی قریشی رحمۃ اللہ علیہ اور مست سائیں محمد علی قلندری ہوں۔ یہی لوگ تو عشق کی چلتی پھرتی تفسیر تھے، آج اُن کا کردار، اُن کے اشعار اور اُن کی تعلیمات ہی عشق کی تفسیر ہیں۔

روزنامہ "نوائے انصاف" ملتان، روزنامہ "پیش رفت" لاہور، پیر 30 نومبر 2020۔
روزنامہ "ایمان" اتوار 29 نومبر 2020۔

تقاضاءِ وقت اور قحطِ محبت

دوستو! آپ نے اور ہم نے ایک ایسے پر فتن ماحول میں جنم لیا ہے جہاں انسانی اعمال پر شیطانیت کا غلبہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، ہر طرف نفرتوں کو بڑھانے میں یک دم تیزی آ گئی ہے، جب کہ محبتوں کے دریا سوکھ کر خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کہیں پیار کے معصوم باغیچے خشک ہو کر ویران نہ ہو جائیں؟ پھر کسی سائے سے محروم، تعصب کی دھوپ اور تپش میں جلتا یہ سنسار کیا سکون میسر کرے گا؟ عشق اور محبت کے لنگروں پر پلنے والے پریت والے پرندے ان حریص اور لالچی ٹولوں کی گرفت میں دم نہ توڑ دیں؟ ایسی صورتحال میں جب انسان پر شیطانیت حاوی ہوگی، تو وہ اسے رنگوں، نسلوں، فرقوں، ذاتوں، قبیلوں اور زبانوں میں تقسیم کرنا شروع کردے گی۔ وہ اتنی نفرت اور تعصب برپا کرے گی کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اس کے ممکنہ مفاد یا نفع کی بنیاد پر دیکھنا شروع کردے گا۔ اس طرح نفرتیں بڑھ کر تناور درخت بن جائیں گی۔ پھر ایک نہ ختم ہونے والا تصادم معاشرے میں چل پڑے گا، جو کتنی ہی نسلوں کے خاتمے کا سبب بن کر انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان دے جائے گا۔ ہم اس وقت ایک ایسے خطرناک دور سے گزر رہے ہیں جس میں صبر اور برداشت ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنی مخصوص خواہشات کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، جن کے اختتام کی کسی کو بھی کوئی خبر نہیں۔

دوستو! صوفیاء کرام کی تعلیم نے ہمیشہ صبر، برداشت اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کا پیغام دیا ہے۔ نفرتوں کی جگہ پر محبتوں کی بات کی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی اپنی محبتوں کے دروازے کبھی بند نہیں کئے ہیں۔ یہ وہی تعلیمات ہیں جو ہمیں انسانیت کے استادِ اعظم خاتم الانبیاء محمد کریم ﷺ سے ملی ہیں۔ لیکن ان کو ترک کر بیٹھنے کے نتیجے میں آج ہم کتنی بے بسی اور اکیلے پن کا شکار ہو گئے ہیں۔ میری گذارش ہے کہ آئیں ایک دفعہ پھر سے عہد کریں۔ محبتیں تقسیم کریں اور نفرتوں کو دُور بھگائیں۔ اس کے لئے رحمت اللعالمین ﷺ کے دامن میں چھپنا پڑے گا جو فقط درود پاک کی کثرت سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

روزنامہ "پروان" ہفتہ 28 نومبر 2020۔

نیا سال اور کھاد کا جہاد

آج بازاروں اور گلیوں میں گھومتے پھرتے نئے سال کی نئی پالیسیاں اور نئی باتیں مختلف جگہوں پر سننے میں آئیں۔شام کے وقت اس مقصد سے بڑوں کی جھونپڑی پر لگی مچ کچہری میں (آگ کے گرد محفل) پہنچے کہ آج نئے عیسوی سال کا پہلا دن یہاں سے دیکھیں گے۔ مہمانوں کی آمدو رفت جاری تھی۔ہر کسی نظریے اور عمر کے دوست آنا شروع ہوگئے۔ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز اپنے ساتھ لے کر آرہا تھا۔یہی تو بڑوں کی جھونپڑی کا کمال ہے۔ نہ کسی کو کہنا پڑتا ہے نہ ہی کسی پر انحصار کیا جاتا ہے. سب کچھ سب کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے، پھر ہر کوئی اپنے مزاج کے مطابق کھا سکتا ہے اور گفتگو کر کے سوال و جواب کر سکتا ہے۔جب تک دل کرے بیٹھے اور جب چاہے اُٹھ جائے۔ کسی بات سے متفق نہ ہونا بھی ہر بندے کی مرضی ہے کوئی بھی قید و بند نہیں ہے۔

وہاں پر کچھ کسان اور کچھ چھوٹے کاشتکار بڑی مارکیٹ میں کھاد سے متعلق اپنی مشکلات بیان کر رہے تھے۔فصلوں کے کم ریٹ ، بیج اور کھاد کے بڑھتے خرچ،اور پھر مارکیٹ میں سیٹھوں کی من مانیاں رلا دیتی ہیں۔کیا کریں؟اگر فصل نہ بوئیں تو کیا کریں؟ اگر فصل بوئیں تو خرچہ کہاں سے لائیں؟اگر جائیں سیٹھوں کے پاس تب بھی سود دینا پڑے۔اگر جائیں بینکوں کی طرف تو گارڈ سے لے کر مینیجر سب جیسے کرپشن کا سرٹیفکیٹ لے کر اترے ہیں کہ نہ موت کا خوف نہ خدا کا ڈر۔اس طرح بیٹھے ہیں کہ رشتہ داروں اور دوستوں کو بھی نہ بخشیں۔ایسا حال کرتے ہیں کہ کاشتکار آخر کار خودکشی کر لیں۔رشوت کی کوئی حد نہیں۔پھر نئے پرانے کیس بنانے کے ایسے ماہر جیسے پیسے بنانے کی فیکٹریاں ہوں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کالے قادن نے بآواز بلند کہا۔

"میرے دوستو! میں نے ایسے حرام خور افسروں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ایک آدھ کو چھوڑ کر زیادہ تر اسپتالوں میں، گدو بندر میں، ایکسیڈنٹ میں، اولاد کی اچانک موت میں اور ایسے اذیت ناک حادثوں میں پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کے لیے کوئی بد دعا نہ کی جائے تو بھی یہ عذاب ہی ان کے لیے کافی ہے۔ سیٹھوں کو دیکھو! ریوینیو کے افسروں سے مل کر غریبوں کو ایسے لوٹ رہے ہیں اور مال کٹھا کر رہے ہیں جیسے ان کو مہلت ہی مہلت ہو۔بڑے نام والی شخصیات کو تو کھاد بیج گھر پہنچا کر آتے ہیں اور بیچارے عوام ذلیل و خوار ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی پانی کی کمی، کبھی کھاد کی قلّت، پھر فصل آنے کے وقت مارکیٹ میں دستیاب گندم کے کم ریٹ اور نئی فصل کے لیے بیج کی ضرورت کسان کو بے حال کر دیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ووٹ سے منتخب شدہ نمائندہ سرکاری عہدے پر پہنچنے کے بعد ایسے غائب ہوتا ہے جیسے کسی ریٹائرڈ آفیسر کی شہر سے آئی دوسری بیوی اپنے شوہر سے دور ہوتی ہے (جو آفیسر کی خوشحالی کے وقت اس سے چپک گئی تھی) ۔ووٹر کا حال اس گاؤں والی بیچاری پہلی بیوی کی طرح ہوتا ہے جو دکھوں کے دنوں میں اس شوہر کے ساتھ تھی۔پڑھائی کے مرحلوں میں، جیب کی کمزوری کی حالتوں میں اور رشتہ داروں کے طعنے سننے کے وقت بھی۔ پھر جب آفیسر نے حرام کی ہڈی چوسنا شروع کی تو شہری فٹ فاٹ بیوی اچھی لگنے لگ گئی۔ بس ایسے ہی حال آجکل ہم کاشتکاروں کے ہیں"۔

کالے قادن کی ایسی گفتگو نے نئے سال کی خوشی کو اس مچ کچہری کے انگاروں کے حوالے کر دیا۔ سب کے چہرے اتر گئے۔ سوچنے لگے کہ یہ کھاد کا جہاد بھی نئے سال میں داخل ہو گیا ہے۔

روزنامہ "پیپلز نیوز" ہفتہ 1 جنوری 2022۔
روزنامہ "کمال نیوز" ہفتہ 1 جنوری 2022۔

کتے اپنے ہی گھر کے دشمن

"جب شرم و حیا اٹھ جائے، تب عزت اور آبرو مر جاتی ہیں۔جب اپنوں کے ہاتھ پگڑی اچھالیں تو پھر غیر تو دھمالیں ڈالیں گے ۔ جب اچھے بھلے لوگ ہار مان لیں توکمزروں سے توقع کیسی ؟ غیرت اور ضمیر کے سودے جب چوک چوراہوں پر ہونگے تو پھر گھروں اور عوام کے فیصلے تو نتھو خیرو ہی کریں گے۔ پھر شیر کی جگہ پر لوفرلومڑ بڑھ چڑھ کر ڈینگیں ماریں گے۔ اور بچگانہ باتیں ہی کریں گے۔ان حالات میں تواوس کے قطروں کو ہی بارش سمجھو"۔

درویشوں کے ڈیرے پر جوگی جمال الدین کی گفتگو دل کو لگ رہی تھی۔ لیکن محاورے اور مثالیں ذرا مشکل تھیں۔

"ہڈیوں پر سے محبت اور سکون کا گوشت حاسد اور جلنے والے لوگ نوچ کر کھا گئے، باقی ہڈیاں گوشت کے بغیر کیلشیم اور پوٹاشیم کی تلاش میں اٹھنے بیٹھنے سے بے بس۔ خالی چار اچھائی کی خبریں وہ بھی مچ (زیادہ آگ) پر لکڑیوں کی جگہ گوبر کے دھوئیں پر۔اس پر بھی صبر شکر ہے"۔

درویشوں کے راز بھی کوئی رازداں ہی جان سکتا ہے ۔ کوئی جاننے والے ہی سوچیں۔

"آگ لگ گئی پانی کو اور مچھلیاں بیچاری آگ کو بجھانے میں مصروف ہو گئیں۔ مگرمچھ انتظار میں تھے، وہ ان معصوم مچھلیوں کا شکار کرنے لگے۔ پتا تب چلا جب خود شعلوں کا شکار ہو کر کباب بن گئے۔ پھر پرندے بدبودار گوشت ٹھنڈا کر کرکے کھا رہے تھے"۔

"اپنے گھر کو آرام دہ بنانے کے لئے دوسرے کے گھر کو تباہ کرنے کا طریقہ کبھی بھی کارآمد نہیں ہوگا۔ کیکر کے درخت سے پھلیاں توڑنے کی کوشش میں کانٹوں سے ہاتھ زخمی ہو سکتے ہیں ۔ گلاب کے پھولوں پر ہاتھ ان کی نزاکت کے مطابق ڈالا جائے کہ کہیں پتیاں کچلی نہ جائیں (اور ساری خوبصورتی کا خاتمہ ہو جائے)۔ کانٹوں کو تو گزند نہیں لیکن نازک نفیس پتیاں بکھر سکتی ہیں"۔

"دنیا میں رہ کر دنیا کو سمجھیں ۔جہاں بیٹھے ہوئے ہو وہاں کانٹے بھی ہیں اور پھول بھی ۔اپنوں اور غیروں میں، رشتیداروں اور دوستوں میں دشمن بھی ہیں۔ لیکن پہچاننے میں دیر ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ گھر کا کتا ہی اپنے ہی خاندان کا دشمن بنتا ہے"۔

خالو ہوٹل والے نے جب یہ باتیں سنیں تو سوچنے لگا کہ حقیقت میں نبن ناٹکی بہت دنوں سے لکھانے سائیں سے میرے ہوٹل کو بند کروانے کے لئے دھاگے ٹونے کروا رہا ہے۔ تبھی تو کل میرا سارا دودھ خراب ہو گیا۔ پھر مجھے سرمائے سائیں نے کہا کہ خیر ہے کیمیکل والا پاؤڈر ملا کر کام چلاؤ۔ لیکن مجھ پر درویشوں کی جھونپڑی کی کچہری (محفل) کا اثر تھا، میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔اتنے میں ولو کے پاس شادی کا جو دودھ بچ گیا تھا وہ لے آیا۔ ہم دونوں کی دہاڑی اچھی بن گئی۔ باقی ہمارے گاؤں کا ماسٹر جی بہت دنوں سے اپنے گنجے سر پر نقلی بال لگوانے کے شوق میں ایسے پڑا ہے جیسے ندیم نسواری سونا بنانے کے چکر میں کہیں بھی گوبر نہیں چھوڑتا۔

روزنامہ "افلاک" پیر 31 جنوری 2022۔

عقل اور علم کے جھگڑے

عقل دونوں طرف لڑتی ہے، کچا راستہ بھی دکھائے اور پکے پر بھی چڑھائے۔ جب عقل زیادہ ہو جائے تو فکر میں فتنہ برپا کرتی ہے اور کبھی عقل فتنے فسادات سے بچاتی بھی ہے۔ پس عقل والے کبھی پاگل کہلاتے ہیں تو کبھی دانا۔ عقل لوگوں کو علم کی انتہا دکھا دے تو ان میں سے بعض اپنی بلند حیثیت کو چھپاتے ہیں۔ کبھی علم عقل کو جلا بخشتا ہے۔ عقل اندھے کو راستہ دکھا سکتی ہے اور کبھی کبھی آنکھوں والے کو بھی اندھا کر دیتی ہے۔ یہی عقل جب شیطانی علم کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو شیطانی شرارتیں شروع کر کے خود کو آزاد اور شوباز بنا کر سارے نظریات کا بائیکاٹ کروا دیتی ہے۔ کبھی کبھی مادیت پرستی کی گود میں بیٹھ کر دنیا کو ہمیشہ رہنے کا ٹھکانا کہہ کر اسے پر از سکون بنانے کے لیے سارے حربے استعمال کرواتی ہے۔ عقل جب عشق کے ہاتھ لگ جائے تو بہت بھاری باتیں کرنے لگ جاتی ہے۔ ریتلی بھٹ پر بھٹائی کے روپ میں لطیف کے نام سے عقل اور عشق کی وہ رمزیں بیان کرتی ہے جو کسی وقت مولانا رومی نے مثنوی میں کہانیوں کے سہارے بیان کیں اور جو رہتی دنیا تک گم نہیں ہوں گی۔ ایسے ہی عشق جب عقل کو جھٹکا دیتا ہے تو کبھی سچل سرمست ہو کر سارا سچ بلوا دیتا ہے اور کبھی عقل کو شکست دے کر منصور بنا دیتا ہے۔ کبھی عشق عقل پر غالب آ کر مجنوں جیسے حسین شخص کو لیلیٰ لیلیٰ پکارتے بازاروں میں گھماتا ہے اور کہیں عقل اس عشق سے شکست کھا کر سسئی، ماروی، سہنی جیسے مایہ ناز تاریخی کردار پیدا کرتی ہے جن کی کہانیاں لطیف سرکار کے کلام کی شکل میں ہمیشہ گونجتی رہیں گی۔ بس عقل اور عشق کے ملاپ میں کبھی عشق کے پیچھے عقل چھپ جاتی ہے کبھی عقل کے پیچھے عشق چھپ جاتا ہے۔ جس عقل والے پر بھی عشق کا پردہ چڑھا وہ لطیف سرکار ہو کر ظاہر ہوا۔ اور جو عقل کا غلام ہوا وہ فرعون شداد اور یزید ہو کر گم ہو گیا۔ بس جس نے علم کو عقل میں جگہ دی وہ عقلمند کہلوایا۔ جنہوں نے سب کچھ سمجھ کر عقلمند اور دانا نہیں کہلوایا وہ وہاں پہنچے جہاں عقل اور علم کا گزر نہیں ہوتا۔

روزنامہ "آزاد ریاست" ہفتہ 19 فیبروری 2022۔
روزنامہ "سنگم" اتوار 20 فیبروری 2022۔

بجھانا سیکھو جلانا چھوڑو

ماچس ایک مفید ایجاد ہے اور آگ جلانے کے کام آتی ہے۔ آگ زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ جہاں یہ کھانے پکانے کی ضروریات پوری کرتی ہے وہیں ٹھنڈک میں گرمائش بھی دیتی ہے۔ صنعتی پیداوار کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن آجکل جو لوگ تیلی جیسی زبان اور ماچس جیسا دل لیکر اس سماج اور معاشرے میں نکل آئے ہیں، انہوں نے انسانی نسل کو درہم برہم کر دیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسی آگ لگائی ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ ہر روپ میں، سیاست، مذہبی شدت پسندی، قلم کا زہر، علم کی کاٹ، جسم اور نوجوانی کی لاپرواہیوں، نئی نسل کی آزادیوں اور اذیت ناک حرکتوں کی وجہ سے ماں باپ کی چیخیں، پریشانیاں اور بے سکونی، منشیات کے زہر، ان سب کے زیر اثر یہ انسان، انسان رہا ہی نہیں۔ حیوانات میں انکے ادنیٰ مخلوق ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھی انکی آپس میں محبت دیکھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے لیکن انسان کو انسان پر رحم نہیں آتا۔ اسی لئے دن بہ دن خیالات اور جذبات میں شدت پیدا ہو رہی ہے اور اس شدت کا ردعمل آتا ہے تو سوکھوں کے ساتھ ہرے بھی جل جاتے ہیں۔ جغرافیائی مافیاؤں کے لالچ اور سود خوری کی لعنتوں نے ساری دنیا کو ایک قید خانے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ کبھی کسی وبا کی صورت میں جراثیم پھینک دیتے ہیں۔ کبھی ڈھیروں بارود کی بارش بلاخوف وخطر کر دیتے ہیں۔ دولت کی ریس جاری ہے اور بیچارہ مسکین سماج مہنگائی کی چکی میں پستا چلا جا رہا ہے۔ عالمی سطح سے لیکر ایک گاؤں اور پڑوس تک رسہ کشی کا عالم ہے۔ بازار میں پراڈکٹ کی آمد پر روز بروز نئی پیکنگ، نئی پالیسیاں اور پیکج۔ اندر کچھ باہر کچھ، ہر میدان میں یہی کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ مسجد منبر سے لیکر سیاست کی کرسی تک آپس میں اتنی لڑائیاں

لگی ہوئی ہیں کہ زندگی کا اصل مقصد فوت ہو گیا ہے۔ لوگ قائدے قانون سب بھول گئے ہیں۔ بغض و عداوت اور صبر برداشت کے درمیان کھینچا تانی کے کیچڑ سے دوسرے کے پاؤں نکالتے نکالتے اپنے ہی پاؤں کیچڑ میں دب جاتے ہیں۔ کوئی طاقتور نکالنے والا موجود ہو تو نکالے۔ انتقام کی آگ کے شعلے بلند ہیں۔ نیک آدمی بھی چپ کا روزہ رکھے کنارہ کش ہو کر کھڑا ہے۔ اب داد فریاد کہاں کی جائے اور کس کے پاس جایا جائے۔ آگ ہی آگ ہے، پانی تو کہیں نظر نہیں آرہا۔ مجبور اور تنگ دست آدمی پیسوں کے لالچ میں ماچس اور تیلی دونوں مقاصد کے لئے نہایت کم دام میں مل جاتے ہیں۔ اور لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے والا ماحول کہیں بھی نہیں۔ یااللہ ! اس آگ کو ٹھنڈا کرنے والا پیدا کر۔

روزنامہ "آزاد ریاست" منگل 22 فروری 2022۔
روزنامہ "پروان" منگل 22 فروری 2022۔

جیتنا ہے تو ہارنا بھی سیکھو

جیت کا لطف اور مزہ اپنی جگہ، لیکن ہار بھی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ اگر ہار کا امکان نہ ہو تو جیت میں بھی کوئی مزہ نہیں آتا۔ جو جیت کے پیچھے دوڑتا ہے اسے راہ میں ہار کو بھی کراس کرنا پڑتا ہے۔ ہار ایک ایسے پُل کی مانند ہے جس سے گذرنا لازمی ہے۔ جو اس پُل سے ڈر کے رک گیا تو وہ دوسری جانب جیت تک کیسے پہنچے گا؟ زندگی کی رونقیں دیکھنے میں جتنی حسین اور خوبصورت نظر آتی ہیں اتنا ہی پریشان کرنے کی طاقت بھی رکھتی ہیں۔ ایک طرف خوشی میں رقص اور شغل تماشہ تو دوسری جانب اداسی، مایوسی اور ناکامی۔ جو ان سارے مراحل سے گزر گیا وہ ہی اس معاشرے میں زندہ دل بن کر ابھرا۔ پھر اس پر ہار جیت کا اثر نہیں پڑے گا۔

جب اچانک غصہ اور طیش حاوی ہو جاتا ہے تو بوکھلاہٹ اور حواس کی ناکامی کی وجہ سے عموماً زبان پھسل جاتی ہے اور الفاظ کے آگے پیچھے ہونے سے جملہ بگڑ جاتا ہے۔ چند الفاظ کی بنیاد پر معاشرے میں محبتوں کی جگہ نفرتوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ پھر کچھ شر پسند انہیں نئے روپ اور نئے معانی دیکر طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور سننے والوں کو لطف اندوز کر کے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے بد دماغ لوگوں کی روزی روٹی اس قسم کے مذاق پر ہی منحصر ہوتی ہے۔

ایک مذاق تو یہ ہے کہ باذوق لوگ اپنے خوبصورت جملوں سے لوگوں کے دل بہلاتے ہیں، اور دوسرا مذاق وہ ہے جو حسد اور بغض میں جلے ہوئے ناکارہ قسم کے دغاباز خود کو معتبر روپ میں چھپا کر انسانی قدروں کی چھیڑ چھاڑ سے لیکر گھٹیا الفاظ کے استعمال تک سے رنج و غم پیدا کرتے ہیں۔ یا کچھ ناسمجھ اور نابالغ انسان لوگوں کے سامنے کسی کی تذلیل کرتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو ایسے ضمیر کے اندھے اور دل کے کالے لوگوں کے لئے فقط دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ کوئی مچھر ایسے لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے ذہن سے حسد، جلن اور شرارت کے مادے کو چوس کر باہر نکالے۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ایسے حضرات کا ماضی کسی مگرمچھ کے بل پر گزرا ہوتا ہے جس کی بھڑاس وہ اس طریقے سے نکالتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ زندگی کے ایسے دور کو حوصلے اور جراتمندی کے ساتھ خوبصورتی سے سجایا جائے اور سب کو سمجھنے اور عزت دینے کے لئے استعمال کیا جائے۔ ورنہ یہ دنیا گندگی کے ڈھیر کی طرح بدبودار ہو جائے گی۔

چھٹکارا یا جھاڑو

صفائی کو نصف ایمان کہا جاتا ہے، صفائی کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ جس میں آس پاس کی صفائی، گھر، گاؤں، ماحول کی صفائی، اور معاشرتی صفائی، سب شامل ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں صفائی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، وہاں نہ مکھیاں اور نہ ہی مچھر نظر آتے ہیں۔ اور نہ ہی گندگی بھرے شاپر وغیرہ کھلے عام گلیوں اور بازاروں میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ گند کے بڑے بڑے ڈھیروں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی قربانی کی عید پر بازاروں میں جانوروں کے اعضاء اور گندگی پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا بلدیاتی نظام تو ماشاءاللہ ! ہر طرف گٹر بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر بارش کے موسم میں تو بچے ان گٹروں میں نہا رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو ہوئی ظاہری صفائی۔ رہی ذہنی صفائی تو جب تک ذہن میں گند کچرا ہو گا وہ ذہن شرارتیں سوچے بغیر خاموش کیسے بیٹھے گا؟ یہ بیماری آجکل زیادہ ہو گئی ہے۔ صرف ایک عام انسان نہیں مملکت کے بڑے بڑے دانشوروں اور اکابر کی سوچ میں فتور ہے ورنہ ایسے کالے قانون لاگو نہ ہوں۔ اس سب کا سبب ذہنی آلودگی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بازاروں، گاؤں، شہر اور پڑوس میں چھوٹے بڑے ایسے ذہنی مریض بکثرت ملیں گے۔ جس کا سبب جھگڑے، نفرتیں، عدم برداشت، فتنہ فساد ہیں جو سب گندگی والے ذہن کی پیداوار کہے جا سکتے ہیں۔ ایسی گندگی اب قلم بند بھی ہو رہی ہے اور کتابی شکل میں فروخت بھی ہو رہی ہے۔ اسی گندگی کو عام کرنے کے لئے سوشل میڈیا سے لیکر الیکٹرانک میڈیا تک کا استعمال بھی ہو رہا ہے۔ اس کے نتائج عوام کو بھگتنا پڑیں گے۔ جب گندگی میں مسلسل تیزی سے اضافہ ہونے لگے تو یہ ضروری ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے جیسے مچھروں کے لئے اسپرے کیا جاتا ہے۔ اور پانی کو صاف کرنے کے لئے فلٹر فراہم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر ذہن گندا ہو جائے تو اس کے لیے اخلاقی اسپرے کے ساتھ صفائی والا جھاڑو اور فلٹر فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔ اور یہ کام وہ لوگ کر سکتے ہیں جو صفائی کرنا جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ صفائی کا عمل تیزی سے آگے لایا جائے تو گندگی سے بچا جا سکتا ہے ورنہ ایسا نہ ہو کہ بہت کچھ گند جمع ہونے کے بعد صفائی کے لئے پھر کہیں باہر سے فارمولا امپورٹ کرنا پڑے۔

روزنامہ "قومی کردار" پیر 18 اپریل 2022۔

معاشرے کی گندگیاں

سائیں گجر جلالی کا نام ہم نے بہت سنا تھا، آپ ہمیشہ امن امان، بھائی چارے اور رواداری کے لئے جدوجہد کرتے دیکھے گئے ہیں۔ آج جب درویشوں کی جھونپڑی میں سائیں پر نظر پڑی تو دل بہت خوش ہوا اور سوچا کوئی سیلفی وغیرہ لی جائے، اس غرض سے جا کر ان کے پاس بیٹھے۔

سائیں گجر لسانیات پر بات کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے :

"لسانیت ایک ایسی وبا ہے کہ کسی خطے کو اگر تباہ کرنا ہو تو وہاں لسانیت کا بیج بو دیں۔ وہ بیج جیسے جیسے بڑھتا جائے گا اپنے ارد گرد اثرات چھوڑتا جائے گا، لسانیت کا زہر آپ کے علمی، روحانی، عقلی، کاروباری، رشتیداری وغیرہ، یعنی زندگی کے تمام شعبوں کو تباہ کرتا جائے گا۔ وہ لسانیت آج اسلام میں فرقہ واریت کی صورت میں، سیاسی پارٹیوں کی دہشت گردی کی صورت میں، سماجی عدم برداشت اور عدم مساوات کے بھیس میں، ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں موجود ہیں۔

لیکن لسانیت کو جواب تب ہی دے سکتے ہیں جب آپ صوفیاء کرام کے نصاب کو سمجھنے کی کوشش کریں، انکی تعلیم اور بھائی چارے کو عام کریں، اور محبتوں کو نفرتوں کے تابع کرنے سے دور بھاگیں۔ نفرتوں کا جواب نفرت سے دینا بہتر ہوتا تو عظیم فلاسفرز سے لیکر انسانیت کے رہبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان درندہ صفت انسانوں کو انسانیت سکھانے کے لئے معافی کا رواج نہ ڈالتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنی ہی بڑی مصلحت پسندی سے کام لیکر قاتلوں کو بھی معاف فرمایا۔ ایسے کردار سے کتنے ہی انسانوں کی زندگیاں ضائع ہونے سے بچ گئیں۔ خون خرابے کے گندے کاروبار سے

ماحول محفوظ رہا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لیے ہی تو عربی اور عجمی کافرق ختم کیا۔انصار اور مہاجرین کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔

لیکن اس وقت بھی منافقین موجود تھے اور آج بھی وہ گوگڑوں کے روپ میں موجود ہیں۔جب بھی، جہاں بھی، جس طرف کی ہوا چلے گی تو وہ گوگڑو اس موسم والا بھیس بنا کر، باہر نکل کر، کبھی مینڈک والی ٹاں ٹاں، کبھی کوے والی کاں کاں کر کے حسد اور تعصب کی وبا پھیلا کر خود چلے جائیں گے۔ پھر سارے گوگڑو مل کر کسی نہ کسی گندگی پر جمع ہو کر حرام اور حلال کو اکٹھا کر کے مزے لے رہے ہونگے۔ان کی پھیلائی ہوئی وبا معصوم انسانوں کو قرنطینہ کرتی جائے گی۔مسلسل قرنطینہ کی وجہ سے معاشرہ لاچار اور ناامید ہوتا جائے گا۔لیکن گوگڑوؤں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی"۔

سائیں گجر کی رازدارانہ گفتگو نے تعجب میں ڈال دیا. سائیں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس نفسا نفسی کے عالم میں ٹریکٹر ڈرائیور کی جگہ پر سیاستدانوں کو بٹھا کر سرکس کرا رہے ہیں۔اب کھاد سونے کے ریٹ بک رہی ہے۔ بیچارے کاشتکار کو پہلے ہی ٹماٹر اور پیاز نے بیہوش کر رکھا ہے۔ ڈیزل سے ٹریکٹر چلانا اب بہت مہنگا پڑتا ہے۔ یا ٹریکٹر کو خود دھکیلیں یا پھر بکرے اور دنبے کی جگہ گدھے کی فارمنگ کی جائے تاکہ ان کی مدد سے ٹریکٹر چلائے جائیں۔ لیکن عام لوگوں کا جو بھی حال ہو گوگڑو پھر بھی گوگڑو رہے گا۔اس کو سب کچھ ہضم ہوتا جائے گا جب تک پیسٹی سائیڈ والا زہر دیکر جان نہ چھڑائی جائے۔اور اس کے باوجود گوگڑو مارکیٹ میں دیکھنے میں آئے گا۔ جہاں بھی ضرورت پڑے گی وہاں آلو بن کر بک جائے گا۔

روزنامہ "ہجوم" ہفتہ 28 جنوری 2023۔

توقعات

توقعات اور توکل میں فرق نمایاں ہے۔ توکل تو اللہ تعالیٰ پر کیا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید کی سورہ الطلاق میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ.

ترجمہ:۔اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے (دنیا وآخرت کے رنج و غم سے) نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے۔ اور اسے ایسی جگہ سے رِزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ (اللہ) اسے کافی ہے۔

لیکن توقعات فطرت میں شامل ہیں۔ایک انسان اپنے اعضاء کو دیکھ کر کہتا ہے، دیکھو میرے بازو کتنے طاقتور اور صحت مند ہیں، اسی طرح اپنی آنکھوں کی بینائی، ٹانگوں کی تیز رفتار اور جسم کی قدامت اور چہرے کی خوبصورتی سے توقعات رکھ کر دھوکے میں آجاتا ہے کہ ان کا ہمیشہ ایسا ہی ساتھ رہے گا۔ وہ اپنی اولاد کو دیکھ کر بھی امیدیں وابستہ کرلیتا ہے کہ یہ میرا سہارا بنیں گے۔ ٹھیک ہے اولاد کو خدمات فراہم کرنے کا حق ہے لیکن کبھی کبھار وقت ان سب توقعات کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔اللہ کی پناہ! بعض اوقات تو والدین زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں۔ اولاد کو یا تو اللہ تعالیٰ چھین لیتا ہے یا اس کی بیوی، مال و دولت اور کاروباری یا منصبی مجبوریاں۔اور بیچارے والدین یا تو نوکروں کے حوالے، اولڈ ہاؤس میں یا فٹ پاتھ پر! اسی طرح اقتدار کی ہوس اور اس پر ناز۔ وہی اقتدار کی ڈور ان کے گلے میں پھندا ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی تمام ضروریات پوری کرتے کرتے تھک کر بھی زندگی کی تمام ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ایک کے بعد ایک اور خواہش سامنے آجاتی ہے۔ جس انسان کا اعتبار اور اعتماد اس کی سواری اور مکان پر ٹکا

ہوتا ہے تو سواری تو وہاں گراتی اور ڈبوتی ہے جہاں ان کو توقع بھی نہ ہو۔ اسی طرح مکان کی مضبوطی پر غرور ہوتا ہے لیکن وہ ان پر ہی گر پڑتا ہے اور انجام وہی ہوتا ہے جو صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔اسی طرح ایک انسان جدید ایجادات پر سوار ان ہی ایجادات کے ساتھ آسمانوں اور زمین کے بیچ میں ہی بکھیر کر رکھ دیا جاتا ہے۔ زمین کی اچھی پیداوار پلک جھپک میں سیلاب کا نشانہ بن جاتی ہے۔ عزیزوں کے ہاتھوں رسوا ہونا، اپنوں سے جھٹلا یا جانا اور ہم سفر روح رواں دوستوں کا بیچ سفر میں ہاتھ کھینچ لینا ، یہ سب مثالیں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عمل انسان کرتا ہے لیکن ہوتا وہ ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ ہمیں فکرِ صوفیاء کرام کے ذریعے یہ سمجھایا گیا ہے کہ قرآن کریم اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق اپنے حقیقی مالک کے علاوہ اور کسی سے بھی توقعات رکھنا فقط غلط سوچ ہیں۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ توقعات اور دنیاداری محدود ہوں اور ساری امیدیں اس ہستی سے وابستہ ہوں جس نے کہا کہ میں "علی کُل شیٔ قدیر" ہوں۔

روزنامہ "انکوائری" جمعہ 23 ستمبر 2022۔

روزنامہ "پروان" جمعہ 23 ستمبر 2022۔

روزنامہ "انکوائری" ہفتہ 24 ستمبر 2022۔

شواہد شناسائی

آج ہر چھوٹی بڑی چیز پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ دنیا جدید انکشافات اور ایجادات سامنے لا رہی ہے۔ ہر ممکن آسائش فراہم کرنے والی چیزیں روزمرہ زندگی میں آتی جا رہی ہیں. یقیناً یہ سب انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ہیں لیکن ان کی وجہ سے انسان آرام پسند ہوتا جا رہا ہے۔

وہ انسان جس نے چٹانوں اور پہاڑوں کو زیر کرنے کے لئے ان کو کاٹا وہ آج ایک بٹن کے پاس بیٹھ کر وہ تمام ضروریات پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک بٹن ایسا بھی موجود ہے جس پر ایک انسان کا انگوٹھا رکھنے کی دیر ہے اور پلک جھپکتے ہی پتا نہیں کتنی انسانی اور حیوانی جانیں ضائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ارد گرد ہر چیز بھی نیست و نابود ہو سکتی ہے۔

انسان جدید دنیا کا متلاشی ہے۔ وہ قانون فطرت کو اپنی عقل اور ذہن کے ساتھ استعمال کرکے اپنی خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتا ہے، اگرچہ اس کا نقصان اس کو بھی اٹھانا پڑیگا۔ وہ اتنی آزاد زندگی گذرانا چاہتا ہے جس میں قدرتی قوانین اس کے رستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔

وہ ایک مرد سے ایک عورت بننے اور ایک عورت سے مرد بننے کی کوشش کر رہا ہے۔جدید اور مصنوعی ذہانت کے توسط سے وہ ضرور ان میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شادی کی رکاوٹیں ضروری نہ ہوں۔ وہ بغیر شادی کے اور بغیر ماں باپ کے انسانی وجود تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ جانوروں اور اجناس کی پیداوار بڑھانے کے لیے ہائبریڈائزیشن استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ بارش، آسمانی بجلی اور سب فطری چیزیں اپنے ہاتھ میں لانے کی بھاگ دوڑ میں دن رات مصروفِ ہے۔یہ تو صحیح ہے کہ اُس کو اُن میں کامیابیاں بھی حاصل ہوئی ہیں، لیکن جہاں ایک انسان کی عمر پچھلی صدیوں میں بغیر ہائبریڈائزیشن اور مصنوعی ذہانت کے آج کے مقابلے میں بہت لمبی اور پر سکون ہوتی تھی آج تمام ادویات، میڈیکل ٹیکنالوجی اور آسائشوں کے باوجود ہزاروں نئی نئی بیماریاں دریافت ہو رہی ہیں اور انسانی عمریں بھی کم ہو رہی ہیں۔ اس پر بھی ضرور تحقیقات ہو رہی ہونگی لیکن

جہاں سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے ڈکیتیاں اور وارداتیں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ رہی ہیں وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے؟

پچھلے دور میں زیادہ ایمانداری، اعتبار اور وفاداریاں دیکھنے اور سننے میں ملتی تھیں۔ لیکن آج ایک انسان دوسرے انسان سے اتنا خوف کیوں کھا رہا ہے؟ ان سب سوالوں کے پیچھے ایک راز ہے۔ ضرور اس پر دھیان دینا پڑے گا۔

پندرہ سو سال پہلے ہمیں محسنِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا تھا کہ آخری زمانے میں ایک دجال نامی شخص نمودار ہوگا۔ وہ یہ سب حرکات کرے گا جن کا ذکر اوپر سطروں میں ہوا۔ وہ انتہائی طاقتور ہوگا اور اس طاقت کا عملی مظاہرہ بھی کرتا رہے گا۔ وہ سب ناممکنات کو ممکنات بنانے نکلے گا۔ وہ فطرت کے خلاف کام کرے گا یہاں تک کہ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرکے دکھائے گا۔ لیکن جلد ہی وہ فطرت کے عین مطابق نامراد اور ناکام ہو کر نیست و نابود ہو جائے گا۔

ہمیں رہبرِ انسانیت خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ذہنی اور علمی معلومات دی ہیں اور اس فطرت کے خالق کی کتاب قرآن مجید کے ذریعے سب کچھ بتا دیا ہے کہ کون کون سی چیزیں دائرہ فطرت کو پامال کرتی ہیں۔ اور اپنے مسائل کو فطری، سماجی، جغرافیائی اور ماحولیاتی ضوابط کے مطابق حل کرنے کے لیے ایک پائیدار قانون فطرت تشکیل دیا ہے۔

کچھ بھی ہو، کتنے بھی جدید حربے اور تحقیقات کیوں نہ استعمال کی جائیں تمام غیر فطری ایجادات اور خرافات ناکام زندگی کا حصہ بنتی ہیں۔ اور سائنسی زاویہ نگاہ سے بھی وہ بالآخر مضرِ اثرات کی حامل پائی جائیں گی۔

ہمیں جدت پسندی کو قانون فطرت کی آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا۔ جب اس فطرت کا مالک چاہے گا آپ کی ساری غیر فطری حرکات ساکت ہو جائیں گی، جیسا کہ آخر زمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے۔ آئیں اپنی، اپنے بچوں، خاندان، اور اعزا و اقارب کی زندگیاں قرآن مجید اور صاحبِ قرآن کی تعلیمات کے مطابق سنواریں۔

روزنامہ "سرمایہ" بدھ 21 ستمبر 2022۔

پس پردہ

کوئی بھی چیز ایسے ہی وجود میں نہیں آ جاتی۔ ضرور اس کے پیچھے کوئی ہاتھ ہوتا ہے، یعنی وہ عوامل جن کی بنیاد پر یہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ پکی پکائی روٹی یعنی چپاتی کھانے کے لیے آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے لیکن یہ روٹی کن کن مراحل سے گذر کر اِس حالت میں پہنچی ہے؟ سب سے پہلے ایک گندم کے بیج کی شکل میں، پھر اس کے لیے زمین، اور وہ بھی زرخیز ہو، پھر اس کو سنوارنے کے لئے ٹریکٹر اور آلات زراعت سے کاشت کی جائے، پھر پانی ہو اور میٹھا بھی ہو، پھر جدید یا دیسی کھاد، اور دیکھ بھال کے لئے ایک کسان یعنی اس کا مالک چاہیئے۔ فصل کو پرندوں اور جانوروں سے بچا کر اس کو صاف کیا جاتا ہے، پھر اسے ایک عمل سے گزار کر آٹے کی صورت میں لایا جاتا ہے، تب اس کو پانی کے ذریعے نرم کرکے آگ کے شعلے کے اوپر پکا کر روٹی تیار کی جاتی ہے۔ مسلسل اتنے محنت طلب مراحل سے گذر کر ہی روٹی کھانے کے قابل ہوتی ہے۔ تو سوچیں کتنے ہی افراد کی ضرورت پڑتی ہے صرف ایک روٹی کو کھانے کے لائق بنانے کے لیے؟

اسی طرح ایک انسان کی تمام ضروریات کی چیزیں جیسے کپڑے، مکان، جوتے وغیرہ، حتّٰی کہ انسانی ضروریات کا اہم جز و پانی، جو زمین کے اندر سے نکلے یا دریا وغیرہ سے، ان سب کے پیچھے ایک حکمت عملی اور ایک مربوط نظام ہے۔

اسی طرح ایک انسان کی فطری پیدائش پر غور کریں۔ ویسے تو ایک خوبصورت انسان آپ کے سامنے کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہے، " میرا وجود فطری ہے اس کے پیچھے کوئی ہاتھ نہیں ہے، میں ایسا ہی بنا ہوا تھا"۔ لیکن جب اس انسان کو اولاد کی طلب ہوگی، وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ننھے منے بچے کو بڑا ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کو اپنے ابو اور امی کی

تمام تکلیفات کا احساس پیدا ہوگا۔ پھر اس انسان کو سوچنا پڑے گا کیسے انہوں نے اس کی پرورش کی، اسی طرح مشکل سے جیسے گندم کے بیج کو سرد گرم سے بچا کر روٹی چپاتی کی شکل میں لے کر آتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کی فرمائش پہ سونے کی انگوٹھی لیکر آئے گا۔ اگر اس کی پیائش میں کوئی تبدیلی کرنی ہوگی تو وہ سنار کے پاس جائے گا۔ جو اپنے کام میں مصروف ہوگا۔ یہ انسان اس کو دیکھے گا کہ وہ کس طرح ایک خام معدن کو آگ پر تپا کر اور لوہے کے اوزار سے مار پیٹ کر خوبصورت زیورات بناتا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی عقل بھی موجود ہوگی تو ضرور وہ یہ سب کچھ محسوس کرے گا۔

اسی طرح کائنات میں موجود تمام چیزیں پہاڑ، سمندر، معدنیات کے ذخائر سے لیکر عالیشان عمارتیں، کہکشائیں، چاند ستارے، سورج، بارشیں، قحط اور زلزلے وغیرہ، اگر سائنسی نقطہ نظر سے بھی آپ تحقیق کریں گے تو پس پردہ بہت کچھ ہوتا نظر آئے گا۔ اسی طرح کسی بیماری کی تحقیق میں مختلف ٹیسٹ اور تجربات کے بعد ہی اس کے اسباب کا پتا چلتا ہے اور پھر اس کا علاج دریافت کیا جاتا ہے۔ حالیہ وقت میں کرونا کی وبا کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

ایسے ہی ایک انسان دوسرے انسان پہ حاوی ہونے کے لئے پرانے دور سے لیکر آج کے جدید دور تک مختلف ہتھیار اور حربے استعمال کرتا رہا ہے۔ تب ہی تو کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ انسان جب کسی آزمائش سے گذرتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ آئندہ وقت میں آنے والے انسانوں کو کم سے کم مشکلات درپیش ہوں۔

میرا آپ کو یہ سب سمجھانے کا مطلب ہے کہ ان سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی پسِ پردہ حقائق اور ہاتھ ہونا لازمی ہے۔ یہ ساری کائنات جس کو صدیوں سے ہر طریقے اور علم سے دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے، اس کی موجودگی اور بقا کے پیچھے بھی کسی مالک کا ہاتھ ضرور ہے۔ اس مالک کے بڑے عظیم بندے جو انبیاء کرام کی صورت میں آئے انہوں نے دعویٰ کیا کہ، ہم زمین پر اس ہستی کے خلیفہ ہیں۔ انہوں نے اس کا کلام، کتاب اور صحیفے انسانوں کو دکھائے۔ ان کے پاس معجزات کی صورت میں کچھ روحانی قوت بھی تھی۔ کسی نے مانا

کسی نے نہیں مانا۔ وقت گزرتا رہا۔ ان سب انبیاء کرام کے بقول ان کے سربراہ، خاتم الانبیاء، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب آئے تو انہوں نے کتاب قرآن مجید کو انسانوں کے سامنے بیان کیا جس میں کائنات کی تخلیق سے لیکر اختتام تک تمام ظاہری اور چھپی ہوئی چیزوں کا تذکرہ ہے، اور کھلی وضاحت کے ساتھ عقلی اور علمی طور پر انسان پر واضح کیا گیا ہے کہ یہ کائنات بغیر خالق کے وجود میں نہیں آئی۔ جیسے آپ ایک گندم کے بیج کو آٹا نہیں کہہ سکتے، اسی طرح یہ ساری کائنات اور زندگیاں خود سے وجود میں نہیں آئیں۔ ان کتابوں میں سارے قانون اور قواعد بھی بیان کیے گئے ہیں تاکہ ایک انسان دوسرے انسان سے زیادتی نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو یہ ڈر بھی دیا گیا کہ تمہیں مرنا بھی ہے اور اُس مالک کے سامنے جوابدہ بھی ہونا ہے۔ خبردار کوئی بھی اپنی حد پار نہ کرے۔ زندگی سے وابستہ تمام تر باتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ کوئی بھی ایسی بات نہیں بچی جس کو کوئی انسان سمجھ نہ سکے۔ پھر انسانوں میں سے جنہوں نے ان تعلیمات کو دل کی آنکھوں سے لیا اور پڑھا، ان کو فقط ان کے تقویٰ اور عمل کی بنا پر معتبر کیا گیا اور بے سمجھ انسانوں کے لیے استاد مقرر کیا گیا۔ جو عین اس کتاب قرآن مجید اور اس کو لانے والی ہستی خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے آئینے میں تعلیم دیتے آئے ہیں۔ آج بھی وہ انسان بہت کامیاب ہے جس نے پسِ پردہ اُس راز حقیقی کو اور، اس مالک حقیقی کو جانا اور اس کا ہو گیا۔

روزنامہ "پاسبان" پیر 19 ستمبر 2022۔
روزنامہ "تیز سماچار" منگل 20 ستمبر 2022
روزنامہ "احکام" بدھ 21 ستمبر 2022۔

سفر مقصد

دوستو! حضرت لعل شہباز قلندر رحمت اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمت اللہ علیہ کے جاگنے کی باتیں سوشل میڈیا پر کی جارہی ہیں۔ حضرت لعل شہباز قلندر رحمت اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمت اللہ علیہ کے جاگنے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنے کردار، تعلیم اور اخلاقیات سے صدیوں جگایا ہے اور آج پھر ان کی تعلیم آپ کو جاگنے کا درس دے رہی ہے۔

"گرمی سردی چلتے رہو بیٹھنے کا وقت نہیں ہے"۔ (شاہ صاحب)

انہوں نے تمہیں ہر وقت تیار رہنے کا درس دیا ہے، صرف اپنے رہنماؤں پر انحصار کرکے ایک جگہ خاموش بیٹھ کر گھر کی ٹوٹی ہوئی چار پائیوں کی رسیاں توڑ کر پھر شکوہ نہ کریں۔ لطیف سرکار رح تو اپنے ایک شعر میں کہہ گئے ہیں جس کی تشریح یہ ہے کہ:

"اپنی فکر، فلسفے اور نظریہ حیات کے لئے سفر کرنا سیکھیں۔ پیروں سے، گھٹنوں، ہاتھوں اور بازؤں کے بل جیسے تیسے، آخری سانس تک چلتے رہیں۔ ایک عضو کام کرنا چھوڑ دے تو دوسرے پر انحصار کریں لیکن تھکنا نہیں ہے"۔

یعنی زندگی کی آخری سانس تک جستجو کرنی ہے۔ ہوٹلوں پر بیٹھ کر بحث مباحثے اور شرطیں نہیں لگانی۔ دیکھیں اس سیلاب کے وقت میہڑ، دادو کے نوجوانوں نے ہمت کی اور اپنے شہر بچائے۔ انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمت اللہ علیہ کے فلسفے سے سبق حاصل کیا۔ علم کی روشنی یعنی انجنیئرنگ ٹیکنالوجی کو استعمال کیا۔

شاہ صاحب کہتے ہیں، جس کی تشریح یہ ہے کہ:

زندگی کے سفر میں سواری (اونٹ سے لیکر جدید ایجادات والی کیوں نہ ہو، وہ) ساتھ چھوڑ سکتی ہے، دنیاوی دوست اور یار بھی منہ موڑ جاتے ہیں، اور طوفانی ہوائیں راستہ میں گرد و غبار کی وجہ سے رخنہ ڈال سکتی ہیں، ساری شمعیں اور لائیٹیں بجھ سکتی ہیں، ہر طرف معاشرتی اندھیرا چھا سکتا ہے اور چاند بھی پچھلے پہر مدہم ہوجاتا ہے، لیکن تم نے مقصد کی جستجو کو نہیں چھوڑنا ہے اس کا پیچھا کرنا ہے۔

آپ نے کہا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہوجائے آپ کوشش جاری رکھیں۔ تو پھر کیا تم نے اس پر عمل کیا؟ انہوں نے اپنی تعلیم میں تمہیں جھوٹ، دھوکہ، فریب اور ذخیرہ اندوزی جیسی خرافات سے روکا ہے۔ کیا تم نے اس پر عمل کیا؟ لعل سائیں نے فحاشی اور بدکاریوں کے اڈے بند کرواکے نیکی کے راستے دیئے۔ کیا تم نے اس پر عمل کیا؟ ان سب نے تمہیں اپنوں اور غیروں کو پہچاننے کا ہنر سکھایا، پھر تم نے ہر وقت جھوٹوں، دھوکے بازوں، شیطان کے ایجنٹوں پر کیوں انحصار کیا؟ تھوڑی سی قیمت پر قیمتی ضمیروں کے سودے کیوں کیے؟ کیا تم قرآن شریف اور صاحبِ قرآن کی باتوں پر عمل پیرا ہوئے؟ اللہ پاک کے بندے آپکو اللہ پاک سے ملانے کا راستہ دکھانے آئے ہیں۔

"اچھے انسان اچھائیاں کرتے ہیں اور برے انسان برائیاں۔ جن کو جیسا سلوک اچھا لگتا ہے وہ ویسا ہی کرتے ہیں"۔ (شاہ صاحب)

آج بھی لعل سائیں کا آستانہ پیاسے اور بھوکے، اندھے اور لنگڑے لوگوں کی آماجگاہ ہے۔ ہے کوئی ایسی عبادت گاہ جہاں پر اتنی بڑی تعداد میں غریب مسکین لوگ بیٹھ کر کھا پی سکیں؟ ان کے فلسفے کو دیکھنا پڑے گا، مگر حسد سے نہیں انسانیت کے ناطے سے۔ آج بھی یہاں رنگ و نسل یا کسی بھی تفریق سے پاک ہو کر خدمت پیش کی جاتی ہے۔

وہ کوئی نقلی اور فریبی پیر یا مولوی نہیں تھے جو جھوٹی جھوٹی کرامات اور نذرانے کے بازار آباد کرتے۔ ان کے رسالے کھول کر پڑھیں، ان کی ملفوظات پڑھیں، کہیں بھی آپکو فریب نہیں ملیگا۔ ان کی تعلیم، پاک کتاب کی تفسیر ہے۔ ان کے حوالے سے غلط خبروں سے پرہیز کیا جائے۔ ان کا انسانیت پہ بڑا احسان ہے، انہوں نے رب العالمین کے فضلِ کریم

کی راہ سمجھائی ہے۔ مگر ہم انکو کرامات سمجھ کر بیٹھ گئے۔ بے عملی والی راہ پر چل کر غلط درس حاصل کیا۔ غلطیاں خود کیں، حرام خوری اور چوریاں خود کیں، عملی کام سے بالکل جواب، بس ایک دم کرامتوں کے ذریعے سب کچھ حل کرنا چاہتے ہیں۔ انگریز تو قرآن شریف سے تسخیر کائنات کے فارمولے تلاش کرکے ستاروں پر جا پہنچے۔ شیخ اکبر ابن عربی رحمت اللہ علیہ نے ایسے علم تلاش کیے جن پر انگریز بھی حیران رہ گئے۔ ان سب کے پیچھے سیرت پاک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس سے ہم نے منہ موڑ لیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اکیلا کرکے کافروں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ بیشک معجزے نبیوں کا ورثہ ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوستوں کی ظاہری حکمت عملی اور جدوجہد اور ہمت نے اس وقت کی سپر پاورز کو بھی مات دے دی۔

آپ سے اپنے ظالم نفس کی خواہشوں پر کنٹرول نہیں ہو سکتا، الزام دوسروں پر لگاتے ہو۔ ان صالحین کی کرامتیں، ان کا عمل اور اخلاق ہمارے لیے تعلیم تھی۔ اگر اس سے درس لوگے تو نہ خود ڈوبوگے اور نہ ہی دوسروں کو ڈبوؤگے، نہ ہی غریبوں کے لیے آئی امداد خود کھاؤگے۔ ہمارے صوفیاء کرام نے انسانوں کو کھانا کھلانے کا فن سکھایا اور ہم نے ان کا مال اوقاف شعبے کی صورت میں لوٹا اور کھایا۔ پھر الزام ان صالحین پر۔ غور و فکر کریں جس کا حکم قرآن پاک میں بار بار فرمایا گیا ہے۔

روزنامہ "پروان" ہفتہ 17 ستمبر 2022۔

فطرت سے کھلواڑ

یہ حالیہ بارشیں اور سیلاب ایک عام واقعہ یا کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے۔ اگر ٹیکنکل لوگ ان کا گہرائی سے مطالعہ کریں، اور کرنا چاہیئے بھی، تو ہر چیز واضح ہو جائے گی۔ آجکل دنیا کی ہر چیز پہ تحقیق ہو رہی ہے۔ یہی تو سائنسی علوم کے فوائد ہیں۔

جیسے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اینٹونیو گوٹیرس نے کہا ہے کہ "فطرت سے کھیلنے میں بڑا نقصان ہے"۔ یقیناً اس کے پیچھے کافی راز چھپے ہونگے، جو ایک اتنے بڑے ادارے کے سربراہ کے طور پہ اس نے یہ کہا ہے۔ ہمارے دیسی لوگ جو موسموں کے متعلق اپنے بڑوں سے کچھ معلومات حاصل کر چکے ہیں وہ بھی اس آب و ہوا کی تبدیلی کے معاملے میں بڑے پریشان ہیں۔

یہ تو ہوئیں ہوائی یا خلائی باتیں، لیکن خاص طور پر پاکستان کے صوبہ بلوچستان سے لیکر سرائیکی بیلٹ راجن پور کا علاقہ جو دریاؤں کے زیر اثر آگیا (اس کو تو دریا کے قریب ہونے کی سزا ملی)، لیکن سندھ کے علاقے خاص طور پر تاریخی شہر اور قصبے بھی آہستہ آہستہ ڈوبتے جا رہے ہیں۔ کلیئرنس دینے کے بعد بھی وہاں کی آبادیاں ذہنی الجھنیں بھگت رہی ہیں، اور کافی زیرِ کاشت آبادیاں اور گاؤں تو شائد صفحہ ہستی سے ہی مٹ گئے ہوں۔ ان میں لاکھوں کی آبادیاں اور ان کے روزگار، اور بڑی بات، کھانے سے لیکر زندگی کی ضروریات کی تمام اشیاء سب نذرِ آب ہو گئی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہر طرح سے انتظامیہ ناکام ہوئی۔ نہ تو انہوں نے گاؤں والوں کو بروقت کوئی آگاہی دی، نہ ان کی ضروری منتقلی کو احسن طریقے سے انجام دیا، نہ ہی ان کے رہنے کے ٹینٹ اور کھانے پینے کا کوئی وافر مقدار میں بندوبست کیا۔

یہ باتیں سیاسی نہیں ہیں نہ ان کے پیچھے کوئی سیاسی مقاصد ہیں۔ عام انسان سے لیکر ہر باشعور آدمی پریشان ہے۔ کسی رنگ، نسل اور زبان سے بالاتر، وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ ہمیشہ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو لوگ سب

سے پہلے اپنے زیادہ قریبی رشتیدار کی طرف دیکھتے ہیں۔ آج وہ لوگ اگر ریاست اور حکومت کو کچھ غصے اور جذبات میں کہتے ہیں تو یہ ان کو محبت اور اپنائیت کا احساس دلاتے ہیں کیونکہ حکومت ان ہی لوگوں کی مدد سے قائم ہوئی ہوتی ہے۔

یہ لوگ مشکل وقت میں ہمیشہ اپنی افواج کو اپنے ساتھ پاتے ہیں، چاہے وہ زلزلہ ہو یا کوئی اور فتنہ برپا ہوا ہو۔ ان کے لیے ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کو ڈھونڈتے ہیں۔آج بھی عام عوام چاہتی ہے کہ ریلیف کا سامان سیاسی لوگوں کی بجائے افواج کے ہاتھوں بلا واسطہ ان تک پہنچے۔ آج جب کہ سارا سندھ ایک عذاب سے نجات حاصل کرنے کو ترس رہا ہے، کیٹی بندر سے لیکر ہر گلی بازار، چوراہے، شہر، گاؤں کو ایک ہمدرد ٹیم کا شدت سے انتظار ہے جو سیاست اور مذہب سے قطع نظر ان کو اعلان شدہ امداد اور عطیات پہنچائے اور گھر بنانے کے معاملے میں خلوص اور دیانتداری سے مدد فراہم کرے۔ عوام پہلے ہی اقرباپروری اور کرپشن سے تنگ آ گئے ہیں۔

آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے کہ عوام کا دل منتخب نمائندوں اور افسران سے ملول ہو گیا ہے۔ وہ ایسی باتیں کرتے ہوئے ملتے ہیں جن سے خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کاش! کوئی انتظامی سیلاب آ جائے جس میں کرپشن کے یہ سب بڑے بڑے بت دھنس جائیں۔

وقت بتا رہا ہے کہ آنے والے وقت میں ڈر کے مارے کوئی بھی سیاسی لیڈر عوام کے پاس نہیں جا سکے گا۔ کیونکہ ہر انسان کو اپنے بچے اور گھر اور ان کے وابستہ وہ ذرائع جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتا ہے بہت عزیز ہوتے ہیں۔ جب وہ ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتا دیکھ لیں گے تو وہ ان بے رحم سیاستدانوں سے ساری زندگی ایسے نفرت کریں گے جیسے یزید کے لشکر سے نفرت کرتے ہیں۔

روزنامہ "سرمایہ" پیر 12 ستمبر 2022۔
روزنامہ "پاسبان" پیر 12 ستمبر 2022۔
روزنامہ "تیز سماچار" منگل 13 ستمبر 2022۔

وقت کی ستم ظریفی

دنیاوی حالاتِ تیزی کے ساتھ اپنی مقررہ منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ جن کی طرف سائنسی نقطہ نظر سے بھی اشارے موجود ہیں۔ تاریخِ انسانیت میں ان کی وجوہات اور پیشنگوئیاں مذاہب کی علمی معلومات میں موجود ہیں ۔خصوصا وہ جو سربراہان مذاہب کے حوالے سے آئی ہیں۔ وہ اس کائنات کو کسی مالک کے ساتھ جوڑتے ہیں، اور مانتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی تخلیق کار لازمی ہے۔ ویسے بھی کوئی چیز بغیر تخلیق کار کے وجود میں نہیں آ سکتی۔ وہ خدا کے بندے ہیں جن کو اس تخلیق کار نے منتخب کیا کہ اسکی مخلوق ان کے ذریعے اِس کائنات کے راز جان سکے، اور اِس کی تخلیق اور تخلیق کار کی حکمت کو سمجھ سکے۔ اس لیے انسانی وجود رکھنے والے ان بندوں پر اپنی کتابیں اور صحیفے اتارے جن میں مخلوق کے لئے وہ ساری باتیں بتائی گئی ہیں جن کی مخلوق کو ضرورت تھی یا ان کو وہ بھلا چکی تھی۔ان سب بندوں کے سربراہ کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ آخری کتاب دے کر بھیجا گیا جس میں کسی بھی چیز کو پوشیدہ نہیں رکھا گیا۔ وجودِ کائنات سے پہلے اور وجودِ کائنات کے دوران اور ختمِ کائنات کے بعد کے تمام راز اس میں سمو دیے گئے اور بار بار اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ اس میں غور و فکر کریں۔ پھر جس کسی نے بھی، جو کسی بھی شعبہ یا مذہب سے تعلق رکھتا تھا، غور و فکر کیا تو اس کو وہ سب معلومات ملیں جو وہ چاہتا تھا۔ اگر کسی کو کوئی بات نہیں سمجھ میں آئی تو وہ اس کو اس ہستی کی عملی زندگی میں تلاش کرے جس پر یہ کتاب بھیجی گئی۔ جس میں دستورِ زندگی اور کائنات کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے۔ ساری مخلوقات کے حقوق اور قوانین و ضوابط کے ساتھ ساتھ تمام سماجی، معاشی اور سیاسی قوانین کو واضع کیا گیا ہے۔ پھر اس ہستی نے ان کو عملی جامہ پہنا کے دکھایا اور اپنے دوستوں کے ذریعے سے ساری دنیا کو جھنجھوڑ کر بتایا کہ زندگی بسر کرنے کا احسن اور صحیح طریقہ یہی ہے. ان کی معرفت سے سمجھائی گئی معلومات کے اس بیش قیمت ذخیرے کو احادیث کہا جاتا ہے۔

پھر وقتاً فوقتاً ان کے پیروکاروں کے ذریعے آج چودہ سو سال گذرنے تک یہ دستور چلا آرہا ہے۔ زمانہ کروٹیں تو ضرور بدلتا رہتا ہے، وقت ایک جیسا نہیں رہتا، لیکن اس نظام کے قائدے اور قانون میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اگرچہ اس کو غلط طور پر ذاتی مفادات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی نے اقتدار کے حصول کے لئے اس کو وسیلہ بنایا۔ کسی نے ان کے صحیح پیروکاروں میں کسی سازش کے تحت پھوٹ ڈالنے اور انتشار پھیلانے کے لئے ان میں اپنی اپنی پسند کے کچھ گروپ بنوا لیے تاکہ ان قوموں کو فائدہ پہنچے جو اس فکر رسالت کو دل سے تسلیم نہیں کرتی ہیں۔ وہ خوفزدہ ہیں کہ ایسا فطری نظام اگر رائج ہو گیا تو ان کا کیا بنے گا۔ تو انہوں نے مخلص پیروکاروں کو ایسی باتوں میں الجھا کر رکھ دیا جس میں عریانیت اور فحش ویڈیوز کا دولت کے حصول کے لئے استعمال اور اس کے ذریعے ساری کائنات کی خرید وفروخت شامل تھیں۔ اس کی وجہ سے سرمایہ کاری کا ایک ایسا نظام برپا ہوا ہے جس میں آج ہم سب پس رہے ہیں۔ مجبوراً کمیشن، سود خوری، اقربا پروری ناجائز حرکات سے وابستگی اختیار کرلی ہے۔ آج جو کچھ برپا ہے اور جو ہو گا ان سب سے ہمیں اس کتاب اور صاحبِ کتاب نے آگاہ کر دیا تھا، اور ان کے مقررہ جانشین، صالحین اور صوفیاء کرام نے ہر زمانے میں ان تعلیمات کے ساتھ ان سب بد قوتوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کرتے آرہے ہیں۔ ان کے پیغام میں انسانیت کے علاوہ تمام مخلوقات کی اہمیت اور ان سے وابستگی کے سب فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن ہم نے جب بھی اس پیغام سے منہ موڑا تو پھر جو ہوا اور جواب ہو رہا ہے یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔

روزنامہ "انکوائری" ہفتہ 10 ستمبر 2022۔
روزنامہ "پاسبان" ہفتہ 10 ستمبر 2022۔

معاشرتی اندھیرا

اندھیرا صرف کالی رات ہی میں نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ برا اندھیرا وہ ہوتا ہے جب معاشرے کے افراد کا اندرون بھی سیم والی زمین کی طرح کالا ہو جائے (جس کو آبادکار زیر زمین پانی پمپ کرکے سیراب کر کرکے تھک جائے مگر سیم والی زمین کوئی پیداوار نہ دے) ۔ایسے ہی ہمارے سیاسی لیڈر ہیں۔ بیچاری عوام کتنی بھی درد سختیاں برداشت کیوں نہ کریں، مجال ہے کہ، کہیں سے کوئی رحم کی نگاہ ڈالیں۔ ہر بات کو آفت الٰہی کہہ کر سب مال سود سمیت ہضم کر جاتے ہیں۔

وہ وقت بہت تنگ ہوتا ہے جب ایک انسان اپنے سامنے اپنے بچوں کو بھوک اور لاچارگی والے حال میں دیکھے یا اپنے خون پسینے سے بنا ہوا گھر چھوڑ کر مجبوراً نکلے۔ ہر پتھر دل بھی موم بن کر روپڑتا ہے مگر کمیشن مافیا اور کرپشن مافیا ایسے پتھر دل بن جاتی ہیں کہ نہ کوئی خوف مرنے کا، نہ ہی خدا کے پاس پیش ہونے کا۔

ضرورتیں ہر انسان کو ہوتی ہیں۔ مگر سروے کرکے دیکھیں جتنا بے حس پڑھا لکھا طبقہ نظر آتا ہے، اتنا بیچارہ ان پڑھ جاہل طبقہ نہیں ہے۔ وہ پھر بھی ترس کھا کر دوسروں کو پانی میں سے نکالنے کے لیئے جان کی بازی لگانے سے لے کر اپنے حصے کی روٹی میں سے بھی حصہ دیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ ڈوبتے انسان کو بچانے کے لیے خالی ہاتھ بھی پانی میں اتر جاتا ہے.

یہاں ڈاکٹر صاحبان انسانوں کے ہوں یا حیوانوں کے، لاکھوں میں تنخواہ لینے کے بعد، ڈی ایچ او ہو یا ایم ایس، یا وٹرنری ڈاکٹر، بس دولت کمانے کے چکر میں ہیں۔ حساب کتاب کرنے کے ایسے ماہر گویا کمپیوٹر ہوں۔

ایسے ہی اعلیٰ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کرسیوں سے چپک کر بیٹھے ہیں۔ گپ شپ، مذاق، ایک دوسرے کو کم زیادہ آمدنی پر طنز اور طعنہ دینا ان کا شغل ہے ۔ ان کی تو

عیدیں ہیں۔ ایک ہی کھانے کے بل مسلسل بنوا رہے ہیں۔ ریلیف کیمپ کوئی نہیں۔ بس ایک ٹینٹ کھڑا ہے۔ سب آکے ایک جیسے پوز لگا کر تصویریں بنوا کر یہ جا وہ جا۔ فوٹو سیشن کے لیے پوری کابینہ ساتھ لے کر گھوم رہے ہیں۔ جتنے فوٹو اپلوڈ کروا رہے ہیں اگر اتنی معاشرے سے رکاوٹیں ختم کرائی جائیں تو مزید شہر نہ ڈوبیں۔ بس بے حسی کی انتہا ہو گئی ہے۔

آج پھر حضرت امام حسین علیہ السلام یاد آرہے ہیں، جو بے سر و سامان، صرف چند ہمدرد ساتھیوں اور خاندانی افراد کے ساتھ، اس وقت کے جابر لالچی معاشرے کے آگے بھوکے پیاسے ڈٹ گئے اور پورا کنبہ تک قربان ہوتے دیکھا۔ صدیاں گزرنے کے بعد بھی وہ واقعہ انسانوں کو رلا دیتا ہے۔ آج بھی دیکھیں گھر کو چھوڑنا اور بال بچوں کی بھوک کیسے رلاتی ہے۔ مگر کربلا میں قہر ڈھانے کے بعد بھی کوفی نمازیں پڑھ رہے تھے۔ آج بھی ایسے ہی ہو رہا ہے۔ اللہ پاک بہتر کرنے والا ہے، مگر ہمارے اعمال اچھے نہیں۔

آزمائشیں انسان کو جھنجھوڑ کر سبق سکھاتی ہیں مگر پتا نہیں ہم کب سمجھدار بنیں گے۔ پانی کے نکاس کا کوئی مستقل حل کیوں نہیں نکالا جاتا؟ دریائے سندھ پورے پاکستان کی نکاسی کرنے کے لیے کافی ہے، بس اُسے راستہ دیا جائے۔ ہماری نہریں اور جھیلیں بھی اضافی پانی نکاسی کے لیے بہت مفید ہیں، مگر ان کو دوبارہ بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن کھانے والے کھا کر باہر ملکوں میں جاکے موج و مستی کریں گے، اور یہ نالے اور ندیاں آئندہ سال کا انتظار کرتے کرتے پھر کوئی بے رحم تباہی لائیں گے۔

روزنامہ "انکوائری" بدھ ۷ ستمبر 2022ء

روزنامہ "پاسبان" جمعہ 2 ستمبر 2022ء

روزنامہ "سرمایہ" بدھ ۷ ستمبر 2022ء

رکاوٹوں کی یہ بستیاں

اللہ پاک نے بار بار اپنے کلام پاک میں آگاہی دی ہے۔ ہمیں چاہیے اس پر غور کریں۔ سورہ ص کی آیت نمبر انتالیس میں فرمایا ہے کہ (مفہوم) "عقل والے بنو"، مگر ہم نے اس عقل کی چیر پھاڑ کرکے، صرف دکھاوے کے لیئے تمام عملی کاموں سے لاتعلقی اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جنگ والے حالات (جن میں انسان گھر بار چھوڑ کر، کچھ مار کر کچھ مروا کر بھاگ نکلتا ہے) سے بھی زیادہ ہیبتناک مناظر نظر آرہے ہیں۔ آدھی رات کو چیختے چلاتے معصوم بچے، بڑی عمر والے عمر رسیدہ لوگ، ننگے سر خواتین جلدی میں بچوں کو سینوں سے چمٹائے یہاں سے وہاں کسی انجانی منزل کی طرف دربدر دوڑتی پھرتی ہیں جہاں کوئی بھی کسی کا نہیں۔ بغیر سواریوں کے جائیں تو کیسے جائیں؟ جلدی میں کیا لیں کیا چھوڑیں؟ ایسے افراتفری کے مناظر نے ان بے گھر لوگوں کو بھی رلا دیا جو پہلے ہی روڑ راستوں کے بیچ میں مچھروں سے آنکھ مچولی کھیلنے کے عادی تھے۔

لیکن اگر اس دنیا میں بے حس انسانوں کی کمی نہیں ہے تو خدا ترس لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ بیشک انسان، انسانوں کے روپ میں دوبارہ لوٹ رہے ہیں اور باقاعدہ انسان اور انسانیت بھی نظر آرہے ہیں۔ جہاں پہلے انسان ڈھونڈے نہیں ملتے تھے اب واقعی انسان ظاہر ہو چکے ہیں۔ بنا تفریق کے متاثرہ لوگوں کی بہت زیادہ مدد ہو رہی ہے۔ یہ شعور کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس میں ان نوجوان باہمت گروہوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہی پل اور لمحات ہوتے ہیں جن میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

اگر ہمارے سیاسی رہبر اور رہنما صرف ایک رات کا قیام اور کباب کا خرچہ سب مل کر جمع کرائیں اور ایک ہفتے کی کمیشن تمام کمیشن مافیا جمع کرائے، اور باہر سے آنے والی

امداد بغیر کسی رکاوٹ کے ان بے سہارا لوگوں میں تقسیم کی جائے، تو سب ماضی کی غلطیاں اور خامیاں یہ قوم معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

تمام چندہ اور نذرانہ لینے والے مافیاؤں سے درخواست ہے کہ اب لینے والے ہاتھ روک کر دینا سیکھیں۔ تمام دروازے کھول دیں۔ جس کی جتنی پہنچ ہے اتنا میدان میں اتر جائے۔ تمام فضول رسمیں اور شاہانہ شوق قربان کرکے وہ رقم ان متاثرین کو دے کر تو دیکھیں کیسے رب العزت آپکو ڈوبی ہوئی چیز کو دگنا کرکے دیتا ہے۔ ان خون پیتے مچھروں کی طرح مزید کھا کر کیا کریں گے؟ اب چھوڑا ہی کیا ہے ان لاوارثوں کے پاس کہ اس حال میں بھی وارداتیں کروگے؟ وہ ٹینٹ اور آٹے کے بورے بیٹھکوں گوداموں کی زینت نہ بنائیں۔ ان تک پہنچائیں جن کا حق ہے۔ یہاں سیاست اور مذہبی مسالک کو چھوڑیں۔ جو خالق ہے یہ سب اسکی مخلوق ہے۔ تم نے پھر کونسی تفریق شروع کر دی ہے؟ چھوڑیں سینہ زوری۔ اس کے در پر آئیں کہ ماضی کے تمام گناہوں کی مل کر معافی مانگیں۔ اللہ تعالیٰ دینے والا ہے تو تم بیچ میں نہ روکو۔ اگر آپ نے دوسروں کو دینا سیکھا تو آپکو بھی بہت دے گا۔ ہاتھ کو روکو گے تو وہاں بھی دیر نہیں ہے کہ آپ کا سونا مٹی بن جائے اور ان کی مٹی سونا بن جائے۔

روزنامہ "انکوائری" جمعہ 2 ستمبر 2022۔
روزنامہ "پاسبان" جمعہ 2 ستمبر 2022۔
روزنامہ "تیز سماچار" ہفتہ 3 ستمبر 2022۔

سیاست سے بھی سیاست

سیاست کا لفظ غلط کاموں میں استعمال ہو کر خوار اور بدنام ہوگیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے اس کی باگ ڈور غلط ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ ہر غلط بات کو سیاست سے منسوب کیا جا رہا ہے، ورنہ سیاست کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ بلکہ سیاست اچھی ہے اگر اس میں اخلاقی پہلوؤں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ تاریخ میں جنگوں کے دوران یقیناً سیاسی حربے استعمال ہوتے تھے، لیکن اگر دو فریق آپس میں کوئی گفتگو کرتے تھے تو ان میں وعدہ خلافی نہیں کی جاتی تھی۔

چالیں چلنا سیاست کی ضرورت ہے۔ اس وقت جب سیاسی اکھاڑے لگے ہوئے ہیں اور ہر طرف پہلوان میدان میں کودنے کے لیے کمربستہ ہیں ایسا نہ ہو کہ سیاست آپ سے بھی سیاست کر جائے۔ دیکھا جا رہا ہے کہ ہر موسم میں، ہر فیلڈ میں، چاہے وہ مذہبی رسومات ہوں یا درس وتدریس کا کام، ان میں ان ٹھیکیداروں کی آپس میں چپقلش دیکھنے والی ہوتی ہے۔

اسی طرح غمی اور خوشی کے مواقع پر بھی رشتے داروں سے، پڑوسیوں سے یا آپس ہی میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ اسی طرح ناگہانی آفات کے وقت فلاحی تنظیموں سے لیکر چھوٹے بڑے لیڈر صاحبان! بس ماشاءاللہ! کیا بات کی جائے، ہم صدقے جائیں ان پر، سب اکھاڑے میں موجود ہوتے ہیں۔

حالیہ بارشوں کے دوران نومنتخب بلدیاتی نمائندے جب ڈیزائن والی ٹوپیاں پہن کر اپنے آپ کو بڑے عزت دار اور بڑے جاگیرداروں کی لسٹ میں شامل کرانے کے لیے مخصوص حلیے اور لباس استعمال کرکے ایک دو سفارشی آفیسروں کو ساتھ ملا کر، کچھ کڑوا پانی پی کر، کچھ کچے پکے چاولوں کی تھیلیاں تھام کر چند سڑکوں پر اپنے ہی کسانوں کو دیگر لفافی صحافیوں سے تصویریں بنواتے ہیں تو ان کے چہرے دیکھ کر کبھی تو ہنسی آتی ہے اور کبھی انسانیت کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی "سیاست" کرنے والے اس بے وقوفانہ کردار پر رونا آجاتا ہے۔ کاش ہم انسان بن کر جئیں۔ یارب العالمین! ہمیں اور ہماری بچیوں اور عورتوں کو ان سیاسی لٹیروں کے پکچر پروگرام سے بچا کر رکھ! پہلے ہی اپنا گھر، جیسا بھی تھا، چھوڑ کر اپنے

خاندان اور جانوروں سمیت سڑکوں پر آ بیٹھے ہیں اور دونوں اطراف سے پانی میں گھر گئے ہیں۔

ایسے دھوکے باز لٹیرے بھی ہیں جو ایک چاول کی پکائی ہوئی سادہ سی دیگ، جو تقریباً چھتیس سو روپئے میں بن جاتی ہے، کا بل اکیس ہزار بنا کر حرام کی کمائی سے جیبیں بھر رہے ہیں۔ حرام کھلانے والے بھی ہیں۔یہ جعلی بل بلدیاتی ادارے وصول کر رہے ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ ہر ایک کو ایک نہ ایک دن رب کے حضور جانا ہے۔

لیکن ہم نے ایسے غیر مسلم لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنھوں نے تین چار ہوٹل بک کرا کر کئی دنوں سے مفت میں چنا روٹی کھلانا شروع کر دی ہے۔انہوں نے کوئی پکچر بھی نہیں رکھی، نہ ہی فوٹو بنوائی ۔اور ہوٹل مالکان کو بھی تاکید کی ہے خبردار اگر کسی نے ہمارا نام لیا!آپ صرف اپنی مزدوری اور رقم سے غرض رکھیں۔ ادھر ماشاءاللہ نیک چہروں والے وہ بھی ہیں جو لاوارث عورتوں کے پچیس ہزار میں تین چار ہزار کٹوتی کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں ۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ایسے لوگ اپنے آپ کو انسانوں کی بجائے حیوانات میں بلکہ خونخوار جانوروں میں شمار کریں۔

ایک طرف کچھ عوامی نمائندے کہتے ہیں کہ سیم نالوں کو کٹ لگوائیں۔ دوسری طرف ایک ٹیم اپنے ہتھیار بند کارندے بٹھا کر جنگ وجدال کا فتنہ برپا کرنے کو تیار ہے۔براہ مہربانی یہ کام انتظامیہ کو کرنے دیں جو قیمتی قومی اثاثہ جات کی حفاظت کے ساتھ پانی کی نکاسی کے لیے ایک ہمہ پہلو جائزہ لے کر ایک متفقہ حل نکالیں۔ عوام کو ایک دوسرے سے لڑانے کا اور سیاست سے سیاست کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔

میری اس تحریر کا مقصد کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہے۔ایک حقیقت ہے جو ہم نے دیکھی ہے۔بس خدارا عوام پر،اور اپنی دنیا اور آخرت پر رحم کریں۔

روزنامہ "انکوائری" بدھ 31 اگست 2022۔
روزنامہ "پاسبان" بدھ 31 اگست 2022۔
روزنامہ "جاگو عوام" جمعرات 1 ستمبر 2022۔

عورت کھلونا نہیں ہے

اللہ تعالیٰ کی کائنات کے بڑے حسین رنگ ہیں۔جن میں عورت بھی ایک خوبصورت رنگ ہے۔یہ تخلیقِ کائنات کا ایک معتبر کردار ہے۔اماں حوا کا پیدا ہونا بھی ایک نشانی تھی کہ بنی آدم کے وجود کی افزائش کے لئے عورت کتنی اہم ضرورت ہے۔

عورت کے بغیر محبت کا دعویٰ بے معنیٰ سا لگتا ہے۔ جتنے بھی اعلیٰ کردار دنیا سے گذرے ہیں،ادیب، شاعر، فلسفی، امیر، غریب یا گداگر، بلاواسطہ یا بالواسطہ عورت کسی نہ کسی روپ میں ان کے ساتھ نظر آتی ہے۔

اگر ایک ماں کا وجود نہ ہو تو ساری کائنات بے رنگ دکھائی دیتی ہے، ماں کی آغوش، اس کی ممتا اور اس کا سایہ، اس کی تربیت اور اس کی لوریاں، اگر کسی نے نہیں سنیں تو وہ شخص اپنے آپ کو بڑا بدبخت سمجھتا ہے۔

اسی طرح بچپن میں ایک بہن کے ساتھ مذاق مستی، کھیل کود میں ناراض ہونا، منانا، پھر ساتھ کھیلنا، یہ حرکتیں ساری عمر نہیں بھول سکتے ہیں۔ایک بہن کبھی بھی اپنے بہن بھائیوں کو بددعا نہیں دیتی، ہمیشہ بھائیوں کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہے، اور ایک بیٹی ماشاءاللہ جس گھر میں نہ ہو وہ گھر ویرانا دکھائی دیتا ہے.

بیٹی ایک ایسی رحمت اور نعمت ہے، جس کے لیے جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ایسی نعمت کو پڑھا کر، یونیورسٹی تک اعلیٰ تعلیم دلوا کر اس کی زندگی کے فیصلے سے کھلواڑ کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔

جب خود ہمارے آقا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اماں فاطمہ زہرا علیہا السلام سے شادی کے بارے میں رضامندی پوچھی تھی تو پھر آج کے والدین کو کیا حرج

ہے؟ کیا اُس رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی شان اور عزت میں معتبر ہو سکتا ہے؟ نہیں! یہ فقط ایک انائیت ہے جو اپنائیت کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک رحمت زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ہمیشہ ندامت محسوس ہوتی رہے گی۔

اسی طرح ایک عورت کا مرد اس عورت کے لیے محفوظ چار دیواری کی مانند اور اس کا رکھوالا ہے۔ اگر وہ اپنی چوکیداری میں خیانت کرتا ہے تو اُس کی دیانتداری پر آنچ آجاتی ہے۔ اور عورت اپنی چار دیواری کی مالکہ ہے اس کو اپنے فرائضِ منصبی سے بغاوت نہیں کرنی چاہیئے۔ سارے گھر کے افراد چاہے وہ اس کے مرد کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں ان سے اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے کبھی بھی گھر برباد نہیں ہوگا۔ گھر میں مسئلے مسائل تب پیدا ہوتے ہیں جب ایک عورت اپنی زبان کو دانتوں سے باہر نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ بتیس دانت اس زبان کو قابو کرنے کے لیے ہیں۔ جب دل کی چھپی ہوئی بات زبان سے نکل کر باہر آجائے تو بڑا فتنہ برپا ہو جاتا ہے، بس ہر عورت کو کھلونا بننے سے بچنا چاہیئے۔ نہ خود کھلونا بنیں اور نہ ہی کسی کو کھلونا بننے دیں۔

روزنامہ "سرمایہ" جمعرات 18 اگست 2022ء۔

قانون کا منہ کُھلا ہی اچھا لگتا ہے

قرآن پاک نے ترازو کو اہمیت دی ہے۔ محشر کا میدان بھی انصاف کے لیے سجایا جائے گا۔ اسی طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی قانون کو سب کے لیے ایک جیسا قرار دیا ہے اور قسم کھا کر کہا کہ اگر بیٹی فاطمہ خاتونِ جنت پر بھی کوئی چوری ثابت ہو جائے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

خلفاء راشدین کے زمانے میں وقت کے قاضی القضات کا منصب علی سائیں علیہ السلام کے حوالے کرنے کا مقصد حق اور انصاف کا بول بالا کرنا تھا۔ علی سائیں علیہ السلام کے فیصلے تاریخ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی ریاستوں اور خاص طور پر سلجوق اور عثمانی سلطنت کا بھی قانون پر بڑا فوکس ہوتا تھا۔ یہ ہی ان کی بقا کا دارومدار تھا۔ یورپی ممالک نے بھی اپنے ہاں انصاف کو باقاعدہ سختی کے ساتھ قائم رکھا ہوا ہے۔ وہاں قانون کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ فیصلے گواہیوں کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں خطائیں بھی سرزد ہو سکتی ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ خلفائے راشدین رضہ سے لیکر بڑی ریاستی ہستیوں نے بھی عدالت میں پیش ہو کر انصاف کا مقام بلند کیا ہے۔

ایسے ہی کئی آئمین علیہ السلام، بزرگوں اور عالموں کو بھی عدالت میں کھڑے ہونا پڑا ہے، مگر انہوں نے کتنے ہی اختلافات کے باوجود قانونی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے صبر کا شربت پیا ہے۔

مگر حالیہ وقت میں ہر جگہ ایک مزاحمتی سلسلہ شروع ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر مزاحمت اور فساد والے تماشے بڑھتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ خاص طور پر سیاست میں صبر اور سنجیدگی والا باب ایسے لگتا ہے جیسے آخری سانسیں لے رہا ہے۔ ملکی سیاست سے لے کر لوکل سیاست تک حسد اور انتقام کی آگ ہر کسی کے جسم اور

سینے میں جوش مارنے لگی ہے۔ اقتدار میں آنے والی کوئی بھی پارٹی مخالف پارٹی کو برداشت کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتی۔

دیکھا گیا ہے جو شخص بھی سیاسی اختلاف رائے رکھتا ہے پارٹی اور اس کے حمایتی لوگ اس کو منافق کہنے سے لے کر ہر قسم کے نازیبا الفاظ بولتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی نہیں ہچکچاتے۔ مخالف سمت والا کوئی شخص قبول نہیں کیا جاتا بھلے وہ کتنا ہی معتبر اور بااخلاق کیوں نہ ہو۔ اسکی شخصیت ایک آئینہ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہی پرانی کہانی کہ "اس نے الیکشن میں میرا ساتھ کیوں نہیں دیا" ۔ اپنی ساری خامیاں درگذر، لیکن مخالفت کسی طرح بھی قبول نہیں۔ کسی کی کیا مجال جو رئیس اور وڈیرے، میر یا پیر کے اونٹ کو بھی " پیٹو - زیادہ کھانے والا ہے" کے نام سے یاد کرے۔

اپنا سر بھلے پورا ہی سفید چاندی کیوں نہ ہو مگر دوسرے کا ایک سفید بال بھی اچھا نہیں لگتا۔ یہ چیز صرف نچلی سطح تک نہیں بلکہ لکھے پڑھے حضرات سے لے کر بڑے اداروں اور مقدس مقامات تک پہنچ چکی ہے۔ اسی منفی سوچ کا اثر ہر جگہ پر کرونا کے وبائی مرض کی طرح دیکھا جارہا ہے۔ کرونا مرض کی روک تو فقط ایک انجیکشن، بوسٹر ڈوز اور کچھ احتیاطی تدابیر کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ لیکن دشمنی کی نہیں۔ البتہ چاپلوسی والی پالیسی کے تحت جو شخص کارآمد ہے وہ کچھ وقت پہلے کتنا ہی مخالف کیوں نہ رہا ہو ایسا ہے جیسے ابھی زم زم میں غسل کرکے بیٹھ گیا ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ قانون اور قاعدوں کا منہ باندھنے کی بجائے انصاف کو آزادی والی خوبصورتی بخشی جائے۔ پھر کڑوے اور میٹھے سب ہضم کرنے چاہییں۔ ہر وقت ذاتیات والی رٹ کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ اونٹ کو صرف اپنے مفاد والی کروٹ پہ نہیں بٹھانا چاہیے۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 28 جولائی 2022۔

فتنہ فساد کا گورکھ دھندہ

چرس کے رسیا لوگ اس کو روحانی علاج کہہ لیتے ہیں۔ شراب پینے والے شراب کی بوتل کو زبردستی میں شہد کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب بھی کسی کوے جیسا پرندہ کالا مرغا بتا کر لوگوں کو کھلانے کی کوشش کی جائے گی، تو چونچ سے، پروں سے، یا پیروں اور ٹانگوں سے کسی نہ کسی طرح اصلیت ضرور ظاہر ہو ہی جائے گی۔ گویا جھوٹی بات چھپ نہیں سکتی۔

اور پھر بات "منہ سے نکلی کوٹھے پہ چڑھی"۔ یعنی بات پھیلتی ہے۔ پھر "بات کا بتنگڑ" بن جاتا ہے۔ حدیث ہے "من صمت نجا" یعنی جو خاموش رہا بچ گیا"۔ رہبر انسانیت کی یہ حدیث بتائی تو انسانوں کو گئی ہے لیکن شائد کچھ جانور بھی اس سے سبق لیتے ہیں۔ کالا تیتر کم بولتا ہے اور شکاری سے نسبتاً محفوظ رہتا ہے مگر سفید تیتر زیادہ بول کر اپنے ساتھ کتنے ہی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو شکار کروادیتا ہے۔

جب امریکہ والے دیوی کا درخت 1914ع میں جنگ کے وقت فوج کے گھوڑوں کے کھانے کے لیے کراچی کی بندرگاہ پر لائے، تو وہ پورے سندھ میں متعارف ہوا اور جانوروں کی خوراک کے طور پر تھر تک پہنچ گیا۔ اب یہ درخت آگ جلانے کے لیے بھی کام آتا ہے۔

جب سعودی عرب جانا ہوا تو وہاں بھی دیوی کا درخت نظر آیا۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ ہمارے یہاں سے بھی جانور فروخت ہونے کے لیے سعودی عرب جاتے ہیں. تو مقصد یہ ہے کہ بیج کوئی سا بھی، کہیں پر بھی، بویا جائے گا اس کا اثر دوسری جگھوں پر بھی پھیلتا ہی ہے، چاہے وہ تحریری ہو یا تقریری ۔ اس میں محبت، پیار، اخوت، کردار،

اخلاقیات ہو یا نفرت اور حسد ہو۔ اس کا نشانہ ایک خاص طبقہ ہو یا پوری انسانیت ہو۔ فصل تو پکے گی اور پھیلے گی۔ پورا سماج اس میں سے اپنا حصہ لیگا ہی لیگا۔

ایسے ہی آجکل کی سیاست، پارلیمنٹ سے نکل کر سڑکوں اور سوشل میڈیا پر آ پہنچی ہے، جہاں سے ایک عام آدمی تک آسانی سے دستیاب ہو گئی ہے۔ اب وہ دیوی کا درخت ہو یا گنے کا جوس ہو، بازار میں موجود ہے۔ جس نے آگ لگانی ہو وہ دیوی خرید کر آگ لگائے۔ جس کو مٹھاس اور امن کی پیاس ہو وہ گنے کا جوس پیئے اور پلائے۔ مزاہر آیٹم کا اپنا ہے۔ بس انسان کی سوچ پر منحصر ہے۔

آجکل جھگڑے اور معاملے پھر سے سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں تیلی ہے تو کسی کے ہاتھ میں مٹی کا تیل۔ اگرچہ مٹی کا تیل مہنگا ضرور ہوا ہے مگر آگ لگانے کے لیے پتا نہیں کیسے مفت مل جاتا ہے؟ بجھانے کے لئے محبت اور امن امان کی بلدیہ والی فائیر بریگیڈ تو ہمیشہ دیر کر دیتی ہے کیونکہ اس میں اب اتنی وسعت اور دم نہیں رہا۔ اسکو ہمیشہ ذاتی مفادات کے لئے غلط جگہوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اسکو صحیح طریقے سے چلایا جائے تو یقیناً کتنی ہی جگہوں پہ جلتی ہوئی آگ کو اب تک بجھایا جا سکتا تھا۔

لیکن اس دوَر میں بھی اللہ کے کچھ بندے بیچارے اپنے طور پر ہتھیلی پر پانی لیے گھومتے دیکھے گئے ہیں، آگ بجھے نہ بجھے لیکن انکی جدوجہد کو سلام ہے۔

فلسفہ اخلاقیات

جب کوئی کسی سے پیار کرتا ہے، تو وہ اسکو میٹھے لہجے سے بلاتا ہے، جیسے میرے پیارے، میرے محبوب وغیرہ۔ یہ سب الفاظ خلوص سے کہے جاتے ہیں۔ جیسے کچھ وقت پہلے ایک لفظ "جانی" نے بہت مشہوری حاصل کی۔ چھوٹے بڑوں نے یہ لفظ بولنا شروع کر دیا۔ کافی دوستوں نے اسکو تکیہ کلام ہی بنا لیا۔ بہت سال پہلے ایک ایسے شخص نے ایک انگریزی لفظ ایکچولی (Actually) اتنی دفعہ بولا کے پاس بیٹھے ہوئے بڑے شخص کو غصّہ آگیا۔ بولا" بس کرو ایکچولی صاحب! " سب ہنس پڑے۔ پھر اس نے ایک اور لفظ سن لیا" سائل"، بس پھر اسکو پکڑ لیا۔ لوگوں کو ہنسی بھی آتی ہے پر کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

کچھ وقت پہلے "بھائی جان" بھی مقبول تھا، خاص طور پر بیوپاری طبقے کے لوگ بات کرتے وقت ضرور بھائی جان بار بار کہتے اور راہ چلتے لوگ بھی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے تو "بھائی جان" ہی کہتے۔ اُسکا سبب مخصوص شعبوں کے سیٹھ اور بیوپاری لوگ ہیں۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے انہیں اپنے کاروبار اور فیلڈ کے علاوہ لفظ آتے ہی کم ہیں۔ بیوپاری طبقہ جس میں تعلیم سے بڑھ کر مہارت اور تجربے کی بہت ضرورت ہوتی ہے، اس کے بڑے سیٹھ سے لیکر چھوٹے کاروباری لوگ بھی مخصوص الفاظ اور نظام کو سمجھتے ہیں۔

اصل مقصد بات کرنے کا یہ ہے کہ بات وہ سمجھائی جائے اور ایسے سمجھائی جائے جس میں فائدہ نظر آئے۔ ایسے پیارے ساتھی جو ایک فرد کے نہیں بلکہ سب کے ہمدرد ہونگے وہ چاہے کاروباری ہوں یا قلم کے مالک، سیاسی، سماجی، یا روحانی ہستیاں، ان کا مقصد عوام الناس کا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ نہ تو کسی فرقے کی سائیڈ لیتے ہیں نہ ذاتیات اور لسانیات سے واسطہ رکھتے ہیں۔ یقیناً وہ بھی معاشرے کے فرد ہیں اس لیے ریت ورسم کے تحت تو چلیں گے لیکن انسانیت کی خیر خواہی کو کبھی پس پشت نہیں ڈالیں گے۔ قائدے اور قانون کی پاسداری کرتے ہوئے حقوق انسانیت کے لیے ضرور جدوجہد کریں گے۔ تنقید اور تبصرے سے زیادہ عملی کام کر کے دکھائینگے۔ مذہبی بنیادوں کو غلط سلط کہنے سے کنارہ کریں

گے۔اپنے نظریئے کو عملی اور جامع طور لیکر آگے چلیں گے اور ایسے سمجھائیں گے کہ ایک جاہل سے لیکر پڑھے لکھے لوگوں تک، ایک امن پسند سے لیکر ایک وحشی شخص تک کو بھی آسانی سے بات سمجھ میں آ جائے۔ اپنی بات بتاتے وقت دوسروں کے حال احوال بھی سنیں اور سمجھیں کہ آگے والا شخص اصل میں کہنا کیا چاہتا ہے۔ سماج اور معاشرے نے اسکو اس قدر نے چڑچڑا کیوں بنادیا ہے؟ کونسی تکلیفیں دیں ہیں جن کی وجہ سے یہ اس حد تک بغاوتِ پر اترآیا ہے؟ اگر اسکی بات میں وزن ہے تو اس کی شکایت کا نرمی سے امکانی حل نکالا جائے جو وقت اور حالات کے مطابق ہو۔ نہیں تو صبر کی زبان میں رمز اور ریت سے ایسے سلجھائیں جس میں اُس فرد، اُس فیملی، اور مکمل سماج کا چھٹکارہ ہو۔

ایک فرد کے ناکارہ بننے کی وجہ سے پورے گھر سے لیکر کتنے ہی فرد، محلّہ اور برادری نامکمل ہو جاتے ہیں۔ پیسوں کو سب کچھ سمجھ کر، صرف ایک فرد کے منشیات جیسے لعنتی کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے یہ وبا دوسروں کے ساتھ اس کے اپنے گھر کا دِیا بھی بجھا دے گی۔ ایسے ہی کوئی شخص منفی انتقامی سیاست کے سہارے مقبول ہونے کی دوڑ میں جو آج کر رہا ہے کل کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ بھگتے گا، بلکہ اُس کے حمایتی پڑوس اور برادری بھی!

ایک بیوپاری سود کے شارٹ کٹ کے ذریعے امیر ہو تو سکتا ہے لیکن اپنی جمع کی ہوئی تمام رقم سود سمیت دوسروں کے لیے چھوڑ کر ایک دن مالک حقیقی کے سامنے سود جیسا گناہ کبیرہ ساتھ لیکر قبر میں چلا جائے گا۔ یہی حال ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے کا ہے۔ دنیاوی پڑوسیوں کی طرح قبرستان کے پڑوس والے بھی اِس کی قبر کی آگ سے پناہ مانگیں گے۔اب بھی وقت ہے۔ تو بہتر ہے ابھی آئیں اس محبوب کی بات کریں جو بالکل سچ اور حقیقت ہے۔ وہ ہے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تعلیمات سمجھنا دیکھنا، پڑھنا اور اس پر عمل کرنا۔ وہ کسی بھی فرقے، رنگ، نسل، اور کسی بھی انسان کی میراث نہیں۔ جہاں سے وہ ملے اس کو لپٹ جاؤ۔ یقیناً اتنے فائدے ملیں گے کہ سوچ نہیں پاؤ گے۔

روزنامہ "پروان" جمعہ 22 جولائی 2022۔

کلاچی سے کراچی

کراچی (کلاچی) کی بات کریں اور حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمت اللہ علیہ کی بات نہ کی جائے تو یہ تاریخ سے ناانصافی ہوگی۔سائیں عبداللہ شاہ غازی رحمت اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش 98 ہجری اور وصال مبارک بمطابق 20 ذوالحج 151 ہجری ہوا۔ آج 13 جولائی 2022 جب یہ کالم لکھا جارہا ہے کلفٹن میں لگاتار بارش برسنے کی وجہ سے تقریباً چھے فٹ پانی کھڑا ہونے کی اطلاع ہے۔ وہاں ایک پہاڑی پر سائیں عبداللہ شاہ غازی رحمت اللہ علیہ ابدی آرام کر رہے ہیں۔ عقیدتمندوں اور مخیّر حضرات کی طرف سے وہاں ایک خوبصورت محل نما روضہ پاک تعمیر کیا گیا ہے۔

سائیں عبداللہ شاہ غازی کی تشریف آوری، قیام اور آخری آرامگاہ کراچی والوں کے لیے خوش قسمتی کی علامت ہے جہاں ہر وقت انسانوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لنگر اور نیاز تقسیم ہوتی ہے۔ مسکین غرباء اس سے پیٹ بھرتے ہیں۔ بہت سے بے سکون روحانی سکون کی تلاش میں یہاں آنکلتے ہیں۔

سائیں عبداللہ شاہ غازی رحمت اللہ علیہ مدینہ منورہ میں محمد نفس ذکیہ کے گھر تولد ہوئے۔آپکا سلسہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے پانچویں پشت میں ملتا ہے۔ عباسی خلفاء کے ظلم و ستم کی وجہ سے آپ ایک سو انتیس ہجری میں سندھ میں تشریف فرما ہوئے۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس وقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور آپکے فرزند موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی موجود تھے۔ سائیں کو شہید کرنے کے بعد انکا سر مبارک خلیفہ کی طرف روانہ کیا گیا جو اُس وقت کا رواج تھا۔ اس وقت کے خدشات کے باعث قبر مبارک کو راز میں رکھا گیا اور آدھی صدی کے بعد مظالم سے نجات کے بعد ظاہر کیا گیا۔آج وہ کراچی، کلفٹن اور سمندر کی رونق بڑھا رہی ہے۔

کلاچی کو ملاحوں، مگرمچھ اور مورڑے کی جگہ کے طور پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندو کمیونٹی ایک بڑی تعداد میں وہاں مقیم تھی. پاکستان بننے کے بعد نقل مکانی کر کے کثیر تعداد میں باہر سے آنے والوں نے کراچی میں رہائش اختیار کی۔ پاکستان کے دارالحکومت کی حیثیت سے پورے ملک کی مختلف جگہوں سے لوگوں نے آ کر کراچی کو آباد کیا. روزگار اور تعلیم کی وجہ سے کراچی کی طرف آبادی کا رخ بڑھتا رہا۔ افغانستان کی خانہ جنگی اور اس پر غیر ملکی حملوں کی کی وجہ سے بھی کراچی کی آبادی پر بے پناہ وزن پڑتا رہا جو آج تک برقرار ہے۔بے تحاشا غلط پلاننگ، نامکمل ڈرینج سسٹم، بغیر پلاننگ کالونیوں کے قیام اور بلڈروں کی غیر قانونی تعمیرات اور سیاسی ہیرا پھیری کی وجہ سے کراچی نے ہر طرف سے نقصان برداشت کیا۔ پھر وہ مذہب کی آڑ میں فرقہ پرستی اور نئی نئی سیاسی قوتوں کے آنے سے کلاچی واقعی کراچی ہو گیا جہاں ہر قسم کے بیوپار کے ساتھ ساتھ قتلِ عام کے بھی سودے ہونے لگے۔ وقتاً فوقتاً ریاستی مشینری کی کوشش سے امن و امان قائم کیا گیا اور جرائم میں ملوث کرداروں کو اپنے انجام تک پہنچایا گیا۔ مگر بیجا منافع خوری، رشوت خوری، اور راتوں رات امیر اور بڑا سیاستدان بننے کے چکروں میں بہت سے پراجیکٹ نامکمل رہے جس کی وجہ سے مقامی لوگوں کو بارش کی صورت میں اور اتفاقی حادثات کے وقت پریشان ہونا پڑتا ہے۔ آبادی کے حیرت انگیز طور پر بڑھنے کی وجہ سے وقتی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ نالے اور نکاسی کا سسٹم سیاست کی بے رحم گود میں ہے۔ کون اسکو سنوارنا چاہتا ہے اور کون اسکو ناکام بنانے کے چکروں میں لگا ہوا ہے؟ لیکن رہائش پذیر افراد سے لیکر صوبہ سندھ اور پورے پاکستان کے کاروبار کو نقصان ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ مویشی منڈی اور تجارتی کاروبار کی بڑی مارکیٹ کی ہونے کے ناطے لاکھوں کروڑوں زندگیوں کے روزگار کا ذریعہ ہے۔ خدارا سب مل کر کلاچی کو کلاچی سندھ ہی رہنے دیں۔

ہجوم یکسانیت وقوف عرفہ

دنیا کے کئی رنگ اور ڈھنگ ہیں۔ایک طرف خوبصورتی، دلکشی اور چمک دمک کے طوفان، اور کھیل کود، رقص اور تماشے لوگوں کے دل بہلا رہے ہیں۔ کوئی بھٹکا ہوا ہے یا آہستہ آہستہ بھٹک رہا ہے تو کیا؟ کسی کو پرواہ نہیں۔ مگر اسی کائنات میں ایک اور ہجوم مکمل یکسانیت کا مظہر ہے۔جس میں ہر طبقے کا تونگر (طاقت والا) اور کمزور، امیر اور غریب، بادشاہ اور عوام، تخت اور بخت کے والی، سب دو دو چادروں میں لپٹے ہوئے۔ مقامِ عرفات سے لیکر مزدلفہ اور منیٰ تک، ایک ہی تسبیح اور ایک ہی آواز، ایک ہی مالک ایک ہی خالق،

"ایاک نعبد وایاک نستعین"

"اللہ اکبر اللہ اکبر"

کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ہر طرف سفیدی ہی سفیدی نظر آرہی ہے، نہ بچوں کی فکر نہ گھر کی۔ بس استغفراللہ، استغفراللہ کی پکار، رحم کے لیے۔ جیسا زاہد و عابد ویسا ہی گنہگار انسان، سارے ایک صف میں۔ پتا نہیں کس کی پکار پسند آجائے۔ رونے اور سسکیوں میں بس التجائیں ہی التجائیں۔ ایسا کوئی سماں کسی مذہب کے حصے میں نہ آیا ہے نہ آنا ہے۔ دنیا میں میلوں ٹھیلوں، جلسے جلوسوں اور کھیل تماشوں کے اجتماعات تو بے شمار ہوتے ہیں، مگر یہاں وہ دلفریب مناظر نظر آتے ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتے۔ اسی کو اسلام کہا جاتا ہے، جس کو اہلِ اسلام تمام سوچوں، رنگوں اور نسلوں، عربی و عجمی کے فرق سے ہٹ کر ایک میدان میں سردی گرمی، ہر موسم میں فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

یہی خوبصورتی ہے جہاں سارے انا پرست یکساں ہو جاتے ہیں، خالق کے آگے سر سجدے میں رکھ دیتے ہیں اور ایک آسمان کے نیچے کنکریوں پر سو کر محسوس کرتے ہیں کہ قبر بھی سب کی ایک جیسی ہو گی جس میں کسی بھی قسم کی الگ حیثیت حاصل نہیں ہو گی۔ وہ ہی فلسفہ اگر مسلمان زندگی میں اپنائیں تو یہ قوم کبھی بھی کسی سے مات نہ کھائے۔

شیطان کو کنکریاں مارنے کا مطلب ہے اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو مارنا۔

قربانی سے سبق یہ ملتا ہے کہ تمام اعضاء سے لیکر جان اور مال تک کی قربانی دینی چاہیے۔ جانور کا خون بہانے کا مقصد انائیت، خود غرضی اور تکبر کا خون بہانا ہے۔ اسی طرح بال منڈوانے کا مقصد عزت کو سنوارنا ہے اور ایک مخصوص کیے گئے بیت اللہ کے گرد چکر لگانے کا مقصد بے نیاز ہو کر دنیا کے کام کاج سے نکل کر ایک ہی رب پاک کی عبادت کا عہد کرنا اور باقی تمام بتوں کو پاش پاش کرنا ہے۔

کیا معاشرہ بنے گا اگر ہر انسان اسی طرح قائم دائم ہو کر اچھائی کرنے لگ جائے جیسے طوافِ کعبہ کے وقت؟ نہ کسی سے غرض نہ کسی کی پرواہ، نہ ہی کسی سے شرارت، تعصب اور عداوت۔ بس ایک ہی پکار "لبیک!، لبیک!" یعنی ہم حاضر ہیں۔ "اے بندگی کے لائق ہستی ہم حاضر ہیں، آپکی بارگاہ میں، تمام گناہوں سمیت خامیوں اور کوتاہیوں کو۔ بخشش کرنے والی ذات صرف آپکی ہے"۔ تمام انبیاء کرام کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیکر سب خلفاء راشدین اور تمام اولیاء کرام نے ایسا ہی کرکے دکھایا ہے۔ وقت کے شہنشاہوں اور بادشاہوں سے لیکر مزدوروں اور غریبوں نے بھی ایسے ہی کیا ہے۔ ایسی یکسانیت، یکجہتی اور اتحاد، پھر امن و امان ایسا کہ حالت احرام میں ایک جوں کو مارنا بھی منع ہے۔ ایسے قانون اور ضابطے؟ اسی لیے اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس کو رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ وداع کے وقت مکمل فرمایا۔ شرک کے سب بت توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیے۔ ایک ایسا معاشرہ اور سماج بنایا جس کا مقصد بھائی چارہ، امن امان اور اخلاقیات کی اونچی اڑان ہو۔ تمام نوع کے حقوق کی پاسداری، انسانوں سے لیکر حیوانات تک، عورت اور مرد سے لیکر اولاد اور ماں باپ تک، رشتیداروں سے لیکر پڑوسیوں تک، تمام قانونی ضروریات پوری کی گئیں ہیں۔ دنیا کو ایک ایسا آئین اور منشور دیا گیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

روزنامہ "پروان" ہفتہ 9 جولائی 2022۔

عزتیں پامال مت کریں

کہتے ہیں کہ عزت تو بندر کو بھی پیاری ہوتی ہے۔ کسی کی بھی عزت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ نہ ہماری تہذیب اور تمدن یہ اجازت دیتے ہیں نہ ہی کوئی دھرم اور مذہب۔ اگر عزتیں پیسوں کے عوض یا اقتدار کی پاور اور دولت کی ہوس پر نیلام ہوتی رہیں تو پھر انسان کو اشرف المخلوقات کہنے کا کیا جواز؟ اگر کوئی غریب یا چھوٹی نوکری والا اپنے افسر بالا کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا تو یہ کونسا قانون اور انسانیت کا رواج ہے کہ سرِ عام اسکی پگڑی اچھالی جائے؟ کیا اس کی اولاد، اس کے عزیز اور معاشرہ نہیں دیکھتا ہوگا؟ اس طرح تمہاری قدر اور اخلاقیات کس روپ میں ظاہر ہونگے؟ وقت بڑا بے رحم ہے۔ اسی ماتحت کو تمہاری جگہ پر بٹھا کر اور تم پر لاتوں اور مکوں کی بارش کروانے میں دیر ہی کیا ہے اسکے دربار میں؟ خوفِ خدا کریں، کمزوروں کے حال پر رحم کریں۔ خواہ مخواہ کی دھمکیاں دے کر اور رعب جما کر لوگوں کے ذہن تبدیل کرا رہے ہو؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کبھی زور زبردستی اور جبر سے لوگوں کے دلوں کو خریدا گیا ہے جو تم خرید سکو گے؟

صوفیانہ کلچر میں اللہ لوک فقیروں کی بیٹھکوں اور خانقاہوں پر ہر قسم کا رش اس بات کی نشانی ہے کہ وہاں انسان ذات کی عزت اور تکریم کی جاتی ہے۔ اسباب اور وسائل کی کمی کے باوجود دکھ سکھ میں حوصلہ اور ہمت دی جاتی ہے۔ کبھی بھی کسی کی عزت سے کھلواڑ نہیں کیا جاتا۔ کبھی بھی بے بسی اور مایوسی کا سبق نہیں دیا جاتا۔ ہر حال میں دکھوں اور دردوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ظاہریت پرست ٹولیوں والے چاہے کسی بھی منصب پر فائز کیوں نہ ہو، دنیا یا دین کے نام پر فقط ذاتیات اور مفادات کی خاطر پوری انسانیت کی عزت بیچنے میں دیر نہیں کرتے۔

صوفیاء کرام نے ہمیشہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے نفرتوں کو مٹایا اور محبتوں کو فروغ دیا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کھوکھلے نعرے لگاتے ہیں اور رٹی رٹائی باتیں کرتے ہیں۔ وہی پرانے راگ الاپتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا، جانشین بنتے رہتے ہیں۔

آج عزت کو کپڑوں، بڑی گاڑیوں اور بنگلوں میں تلاش نہ کر، اے انسان! کچھ تمہاری بھی غلطیاں ہیں۔ بے عزتی کروا کر پھر معاف کرنے میں دیر ہی نہیں کرتے۔ ذاتی رنجش معاف کر دینا اچھا عمل ہے۔ مگر شرف انسان کی جو توہین ہوئی وہ پورے معاشرے کے منہ پر تمانچہ ہے. اس سے در گزر نہیں کرنا چاہیئے۔

روزنامہ "آزار یاست" جمعہ 1 جولائی 2021۔

تنگ دستی کے تاریک جال

دنیا کی تاریخ میں قحط اور مہنگائی کوئی نئی بلائیں نہیں۔ کبھی مہنگائی روزمرہ اشیاء خوراک کی، کبھی کمی بارش کی اور پانی کی، کبھی ضمیر کے جاگنے کی، کبھی کبھی خُلق کی، کبھی انسانیت اور کم ظرفی کی، کبھی حق اور سچ کی،، کبھی محبت اور بھائی چارے کی، کبھی وفا اور وفاداروں کی، کبھی اصول اور عمل کی، کبھی خوردبینی اور نظرِ کمال کی۔ ان سب کی اصل وجہ اچھے اور اعلیٰ کردار کا قحط ہے، سچائی، فراست، فہم، علم اور عقل کا قحط ہے۔ دراصل باقی ہر شے موجود ہے۔ کسی چیز کی کوئی قلّت نہیں۔ مگر پھر بھی سب ناپید ہیں۔ کیونکہ انکی جگہ نقل نے لے لی ہے۔ مارکیٹ میں جیسے سونے کی جگہ مصنوعی سونا چل رہا ہے، ایسے ہی ایک اعلیٰ انسان کی جگہ بہت سے مفاد پرست لالچی انسان، حیوانیت کی تمام خوبیوں سے مزین، آسانی سے دستیاب ہیں اور بالکل سستے داموں پر۔ پھر بھلا مہنگائی والا سودا کون کرے؟ لیکن نایاب گوہر اصلی انسان چُھپ رہے ہیں یا ستم ظریفی کا شکار ہیں یا پھر انتہائی بے قدری کی وجہ سے گوشہ نشین ہو رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کمال کا یہ شعر کہ۔

"تتي ٿڌي ڪاھ ڪانهي ويل ويهڻ جي"

یعنی گرمی ہو یا سردی، آگے چلتے رہنا ہے".

غمِ انسانیت کا بھی بڑا درجہ ہے، دو تین قدم اٹھانا بھی مددِ انسانیت ہے، کسی کے کام آنا بڑی بات ہے اگر چاپلوسی، خوشامد اور دکھاوے سے وہ پاک ہو۔

مہنگائی کا بوجھ بھی حلال کھانے والوں کو ہی اٹھانا پڑے گا، خاص طور پر غربت کی تکالیف سے لڑنے والوں کو۔ ایک غربت انکی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ آپ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک اصحابی نے بھوک اور افلاس کی شکایت کی اور پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھایا تو آپ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا پیٹ بھی دکھادیا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ایسے ہی آپ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں نے بھی اپنے لیے کوئی مراعات قبول بھی نہیں کیں۔ نبی اولاد کو بھی انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرکے سزائیں دیں۔ تو وہ سیرت ہی تھی جس نے پوری زمین پر ظاہری اور باطنی طور پر فتح پائی۔ آج بھی کامیابی ان ہی لوگوں کے ہاتھ آتی ہے جن کے رہبر اور کارکن، سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہو۔۔ رہنماؤں کو کارکنوں کی فکر ہو، وقت کے بادشاہ کو اپنی رعایا اور ریاست کی، لوگوں کی روٹی اور کپڑے کی فکر ہو۔ ایسے نہیں کہ صرف باتوں کے دھماکے کریں۔ دھماکے تو توپوں کی جگہ پر پٹاخے چلا کر بھی سنائے جاسکتے ہیں۔

نوازشوں کا نیلام

حضرت علی سائیں علیہ السلام کا قول ہے کہ "جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو"۔احسان کے جواب میں شر ملے؟ لگتی عجیب ہے لیکن ہے بڑی فہم و فراست کی بات ۔ان الفاظ میں کتنی بڑی گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ جس سانپ کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلا کر پرورش کی ہو،اس سے بچنا بھی لازمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پالے ہوئے سانپ کا پیٹ بھرا ہوا ہوگا تو وہ ڈنگ نہیں مارے گا، مگر خدانخواستہ اگر وہ بھوکا رہ گیا تو ڈنگ مارنے میں دیر نہیں کرے گا. آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ سانپ اور خونخوار جانور پالنے والوں کی موت بھی اکثر ان کے ہاتھوں سے ہی ہوئی ہے۔

سیانے لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ" نیکی کر اور دریا میں ڈال"۔ یعنی ایک تو ایسے اچھائی کرو کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی حرکت سے بے خبر ہو۔ پھر نہ تو کوئی شکل و صورت یاد رہے گی نہ کسی سے احسانمندی کی وجہ سے کوئی توقعات ہوں گی ۔ اور نہ احسان فراموشی کی صورت میں کسی تعجب کا طوفان برپا ہوگا جو آپکا سکون برباد کرنے کا سبب بنے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر اہلِ بیت کرام، اولیاء کرام اور وقت کے حاکموں کے احسان ،اور بدلے میں ملے اچھے اور بڑے سلوک یاد رکھنے کے لائق ہیں۔یہ سب رِیت و رسم انسانیت کی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت اللعالمین ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ درگذر کرنے کا درس دیتے رہے۔تو حضرت علی علیہ السلام کے اس قول کا مقصد ہے کہ بس درگذر اور معاف کر دیا کریں۔وقت کے صاحبِ حکمت لوگوں نے بھی ہمیشہ یہی کیا ہے۔

ایسے ہی دنیا میں کسی منصب والی کرسی بھی ایک تماشہ ہے۔کرسی پر بیٹھا شخص ایسے سمجھ رہا ہے کہ اس کرسی اور کرسی کے نزدیک ہونے والے بندوں پر میری وجہ سے مہربانیاں ہو رہی ہیں اور وہ میرے وفادار ہیں۔حالانکہ زمین اور کرسی انسان کے نیچے سے ذرا سرکی نہیں اور سارہ ڈرامہ ختم۔زمین پر تکبر سے ٹانگیں کھول کر چلنے والوں کا انجام قبرستان میں جا کر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جن کے نیچے سے زمین سرک کر اوپر پڑ گئی۔

محلاتی سازشیں بھی گھر ہی سے شروع ہوتی ہیں۔ قریب کے افراد جن پر مہربانیوں کی بارشیں برس رہی تھیں، وہی ٹانگیں کھینچنے کی تیاریاں کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت تک چپکے رہیں گے جب تک مفادات پورے ہو رہے ہونگے۔اس لیے مفادات والوں کو اپنے ساتھ دیکھ کر کبھی بھی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔

تو اسی طرح اپنے محل یعنی جسم کے اعضاء جن کو سنوار سجا کر ہر قسم کی آرائش سے نواز کر رکھا گیا ، ان کے شر سے بھی بچنا چاہیے۔یہ صوفیاء کرام کی سوچ ہے۔راز سارے ظاہر ہیں پہچاننا آپکے ہاتھ میں ہے۔اگر تمہارے کردار نے اپنے قواء کو صحیح استعمال کیا تو دنیا اور آخرت میں سرفرازی کا باعث ہونگے ورنہ بدنامی اور ابدی تباہی کا۔ تبھی تو صدیوں کے بعد آج بھی اچھے کردار سراہے اور گائے جاتے ہیں۔ للذا اپنے کردار پر توجہ رکھیں اور اس کو بہتر کریں۔

روزنامہ "پروان" بدھ 8 جون 2022۔

تقدس والی سرزمین

ہر کسی کا کوئی نہ کوئی محبوب ضرور ہوتا ہے، اللہ پاک کے محبوب نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جو باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ دنیا کے تمام مسلمان اس ہستی کے لیے اپنی جانوں سے بھی زیادہ عقیدت اور احترام رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ ہی نہیں۔ وجودِ کائنات سے لیکر آج تک نہ کوئی ایسی ہستی پیدا ہوئی ہے اور نہ قیامت تک کوئی ایسی ہستی پیدا ہوگی جس سے اس قدر پیار اور محبت کی جائے۔ جس کے ادب کے لیے پاک کتاب قرآن مجید میں واضح طور پر احکام نازل ہوئے ہیں۔ دنیا کے نقشے پر کئی لیڈر اور حاکم آئے اور چلے گئے، مگر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ واحد لیڈر ہیں جن کے دیے ہوئے قائدے قانون کو آج تک اہلِ اسلام تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا مقرر کردہ قانون آج تک ہمارے دلوں کی دھڑکن ہے۔ آپ کے نام کی بے حرمتی دنیا کے کسی کونے کا بھی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ تھوڑی سی بے ادبی بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے روضۂ اقدس کو نقصان پہنچانے کے لیے اہلِ اسلام کا روپ دھار کر ناپاک جسارت کی کوشش کی لیکن ہزاروں سازشوں کے باوجود بھی روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تا قیامت قائم رہے گا۔ بڑی بڑی کوششیں وقتاً فوقتاً کی گئیں، مگر مسلمانوں کے جذبے اور جنون کے سامنے سب ناکام اور نامراد رہیں۔ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب اور احترام ہر آنے والے فرد پر لازم ہے۔ مدینہ منورہ کی حاضری بڑے نصیبوں کی بات ہے، کیونکہ آپ رحمت اللعالمین ہیں۔ وہاں چور چکار سے لیکر ہر گنہگار کی بخشش کا آخری ذریعہ ہے۔ آپ رؤف الرحیم ہیں، مہمان نواز ہیں۔ آپکا نام القاسم ہے، آپ بانٹنے والے ہیں۔ ہم کون ہوتے ہیں جو ایسے مہربان کے مہمانوں کی تذلیل کریں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس روضۂ رسول صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے حرمتی ہو۔ ہمارے تمام نظریوں، فلسفوں، سیاسی چکروں اور بادشاہی مان مرتبے سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب بالاتر اور مقدس ہے۔

خبردار! بے ادب لوگ بد نصیبوں کی فہرست میں شمار ہو جاتے ہیں۔ اس لشکر یزید کی طرح، جس نے کربلا کے بعد توہین روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ ان پر قیامت کے دن تک لعنتیں برستی رہیں گی۔

بس آئیں معافی تلافی کریں۔ ایسی پاکیزہ جگہوں کو ذاتی اور سیاسی چکروں سے پاک رکھیں۔ آپکے پاس سیاست کرنے کے لیے اور بہت سے میدان موجود ہیں۔ برائے مہربانی محبت والے دلوں کو اذیتیں نہ پہنچائیں۔ ہمارے دل محبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر ایمان والے نہیں ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ محبوب کو کوئی شکایت پہنچے۔ بقول بھٹائی صاحب کے،

سَرتيون سارِيِ سُڄَ، مَتان ڪا مون سين هَلي،
پاٽي ناه پنڌَ گهڻو، اَڳيان رائو رُڳي رُڃَ،
مَتان مَرِي اُڃَ، ڪا ڏي پاراتو پِرينءَ کي.

میرے ساتھ چلنے والے ساتھیو! محبت اور عشق کے راستے میں ویرانیاں زیادہ ہوتی ہیں، پیاس لگے گی، پانی نزدیک نہیں ہوتا، اگر آپ کو بھوک اور پیاس کا ڈر ہو تو کنارہ کر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ محبوب سے کوئی گلہ کر بیٹھیں۔

سلو پوائزن

کچھ دنوں سے خالو ہوٹل والے کومسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے چکر آنا شروع ہوگئے تھے کہ ہوٹل کیسے چلایا جائے؟ گاہک بھی بیٹھ کر گفتگو کرتے یا خالی پانی پی کر چلے جاتے ، وہ بھی مفت میں۔ پانی بھی دور ہونے کے وجہ سے پیپوں پر لانا پڑتا ہے اور لوگ تو واشروم بھی استعمال کرکے جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک چائے کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے پی رہے ہوتے ہیں۔ایک کیک کو بھی اتنے ہی حصوں میں تقسیم کرکے کھا کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔بچارا خالو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

آج انکل چنبڑ کا پوچھتے پوچھتے چاچا قادن بھی آ پہنچے۔چچا کا کوٹ بھی لنڈے کا لگ رہا تھا اور مفلر گردن میں ٹائی کی طرح بندھا ہوا تھا۔ لیکن خود موڈ میں نہیں تھے۔ پیٹرول کو کچھ تیز تیز گالیاں دے رہے تھے اور دعوت والوں کو بھی بد دعائیں دے رہے تھے۔ بول رہے تھے کہ آئے دن کوئی نہ کوئی دعوت آ جاتی ہے۔ دعوت والوں کو سبق سکھانے کے لئے انکل چنبڑ اور ان کے سارے دوستوں کو ساتھ لیکر جانا چاہتے تھے۔کہہ رہے تھے ”خالو! ہوٹل پر چھوٹو کو چھوڑ اور تو بھی چل!“ ۔

آج پہلی مرتبہ چاچا قادن کو اتنے غصے میں دیکھا۔ پاس جا کر ڈرائیور سے پوچھا، آج یہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ ڈرائیور نے کہا چچا کے ٹھیکے اور جگاڑ والے سارے کام بند پڑے ہیں۔پہلے دوسروں کی کمائی پر چمکتا رہتا تھا اب اپنی حرام والی کمائی نکالنی پڑتی ہے۔ پہلے ہر رات مجرے وغیرہ ہوتے تھے اب وہ عادی لوگ پہنچ جاتے ہیں اور چچا قادن چِڑ جاتا ہے۔اب نفسیات کے ماہرین سے سکون والی گولیاں لے رہا ہے۔

ہوا یہ ہے کہ آجکل کالو طاقت میں مضبوط ہوگیا ہے۔ وہ پڑھا لکھا بھی ہے اور بڑے صاحب تک پہنچ بھی ہے۔ تولو مولو کو ساتھ ملا کر انکو موبائل فونز بھی لیکر دیے

ہیں۔ سوشل میڈیا پر پوسٹیں بھی لگ رہی ہیں۔چچا قادن بچارہ عوام پر رعب جمانے کے لئے کبھی کہاں تو کبھی کہاں۔ بڑے آفیسروں کے ساتھ ایسے پوز لیکر پھر مجھ سے اپلوڈ کرواتے ہیں۔ پھر سوشل میڈیا والے جو میری بے عزتی کرتے ہیں، نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ عوام میں بڑا شعور پیدا ہوا ہے، اب ہمیں کوئی سلام بھی نہیں کرتا۔ہماری اوطاقیں ویران پڑی ہیں۔ فیصلے وغیرہ تو بس پرانی کہانیاں بن گئی ہیں۔ کوئی امید بھی نہیں ہے کہ چچا قادن جلدی کہیں بلدیاتی نمائندے کا حلف اٹھائیں گے۔ کوئی جگاڑ ہو تو اور بات۔ چچا کی نہ تو کوئی اولاد اور نہ ہی گھر والی رہی ہے۔ پھر غیروں کے بچوں پر فضول خرچی نے کنگال کردیا ہے۔ خوفزدہ ہے کہ خدانخواستہ وقت بدلا تو یہ بگڑے ہوئے عوام کیا حشر کریں گے؟ کہیں ساری پرانی باتوں کا انتقام تو نہیں لینا شروع کردیں گے۔ بس اس سوچ نے گھلا کر رکھ دیا ہے۔یہ ہر روز کا میٹھا زہر مار دیتا ہے۔اب تو نشے بھی نہیں ہوتے۔

درویش نے بیٹھے بیٹھے آہستہ آہستہ سے کہا،”جس کسی سے بھی دشمنی ہو اس کے گھر والوں کو شراب نوشی پر لگوادیں۔ پھر بیٹھ کر اپنی دشمنی کے مزے لیتے رہیں۔ یہ سلو پوائزن خود ہی آپ کا انتقام لے لے گا“۔

زندگی ایک تماشہ

اگر زندگی کی حقیقت کو پانا ہے تو زندگی میں ہی تلاش کرو۔ پھر اس کی رونقیں، نخرے اور ادائیں سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے گی۔ بہت سے خفیہ رازوں تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔ جب جان پہچان ہو جاتی ہے تو سلیقہ اور ہنر سیکھ لیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی نیا افسر اپنے علاقے میں تعینات ہو کر آتا ہے تو وہ معلومات لیتا ہے کہ میرے علاقے میں کون کون سے پاتھاریدار (چوروں کا سردار یا پناہ دینے والا)، چور چکار، رہزن وغیرہ ہیں لیکن پھر اِن کو چھوڑ کر اُن کو ڈھونڈنے کے لئے نکل پڑتا ہے جن کی ناراضگی کی وجہ سے سیٹ خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ پھر وہ بچارہ افسر معلومات لیتے لیتے انکے ٹھکانوں اور اوطاقوں کے چکر کاٹنے کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اب سِیٹ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ایسے ہی ایک منشیات فروش بھی علاقے کے لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے ساری حکمت عملی اور وسیلے استعمال کرتا ہے یہاں تک کہ حرام کمائے ہوئے مال میں سے بھی کچھ حصہ خیرات کرتا رہتا ہے اگرچہ ایسے ہی ناگواری کے ساتھ جیسے موبائل کے بیلنس پر ٹیکس دینا، پٹرول لیتے وقت کچھ پوائنٹ ہضم ہو جانا، فصل دینے کے وقت کسان کے پسینے کی کمائی والی فصل کاٹنے کے نام پہ کاٹ پیٹ وغیرہ۔ بس ایک رواداری سے زندگی کا دستور چل رہا ہے۔ کوئی غربت میں روکھی سوکھی کھا کر بھی مطمئن تو کوئی پانچ چھے بنگلے، کار، گاڑیاں اور بہت سے لذیذ کھانوں کے ہوتے ہوئے بھی پھر بھوکا ہے۔ بس کالی قبر کہہ رہی ہوگی کہ آؤ میں تمہیں پیٹ بھر کے کھلاؤں۔ کسی کو خوشی میں بھی غم اور اداسی کا ایک انجانا خوف ہے اور دوسری طرف کوئی غم میں بھی خوش، اللہ تعالیٰ کی حکمت پر راضی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ زیادہ سوچ کر بیمار کیوں پڑے؟ ایک امیر کو دیکھو تو غربت اور کمزوری کا ڈر لگا ہوا

ہے۔ وہ سوچ سوچ کر شکر اور بلڈ پریشر سے ہوتے ہوئے موت کی وادی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ عمدہ اور لذیذ کھانے امیر کے لیے میسر تو ہیں لیکن کھا نہیں سکتا۔ دوسری طرف بچارہ غریب ہی واقعتاً امیر، کیونکہ جو خوراک میسر ہے پیٹ بھر کے کھا تو سکتا ہے۔امیر نے جو کپڑے پرانے کر کے چھوڑ دیئے غریب نے وہ لنڈے سے سستے خرید لیے اور ٹپ ٹاپ ہو کر آ گیا۔اب کون دیکھتا ہے کہ کہاں سے لیے؟ واہ رے غریب تیری خوش قسمتی! پھر صحتمند کو بیمار ہونے کی سوچ، اور بیمار شخص صحتمند ہونے کی تیاری میں خوش کہ ڈاکٹر نے اس کا پیکج کر دیا ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی نے مجھ جیسے کو بہت دنوں کے بعد نیٹ کا پیکج کروا کے دیا ہو اور میں خوشی میں جھومتا پھروں۔ بس مریض ڈاکٹر کا پیکج کا کنفرم ہونے میں خوش۔ ایسے جیسے کوئی بزرگ کچھ پیسوں کے بدلے کسی گنہگار کو جنت کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں دیدے اور بولے "بس پچھلے سب گناہ صاف ہو گئے پھر جا کر نیا اکاؤنٹ کھول لو"۔ ایسے ہی ہمارے معززین رمضان میں عمرہ اور اعتکاف کر کے پھر آ کر حرام کمانے میں لگ جاتے ہیں۔ بس ایک عجب کھیل ہے جیسے ساری کائنات کا فیصلہ اس کے مالک کے پاس نہیں انہوں نے اپنے پاس محفوظ کر کے رکھا ہو۔ یا جیسے بیٹی اور بیٹا دینے کا اختیار ان کے پاس ہو۔ ایک ایسا تماشا ہے جس نے پتا نہیں کتنے تماشوں کو جنم دے دیا ہے۔ ایک افراتفری، نفسا نفسی کا عالم ہے۔

سائیں سلامت تو آج ایک نیا ہی قصہ بتا گئے ہیں۔ لیکن ہمیں ایک سوچ اور درس دے کر گئے ہیں کہ انسان کو موت کے وقت کا کچھ پتا نہیں، پر دیکھو ارادے کتنے بڑے اور پکے۔ جب ہم محفل سے اٹھے تو زندگی ایک تماشہ نظر آ رہی تھی۔

بغیر پانی کے غسل خانہ

آج بوڑھا جاگن بالکل جلا بیٹھا تھا۔ سلام کرتے ہی کہنے لگا، آجکل کے لوگوں کو دیکھو! ہم تو پینے کے پانی کے لئے پریشان ہیں اور یہ چلے ہیں غسل کرنے کے لیے، ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا لیے۔ اور کپڑے بھی کاٹن کے۔ شاید دعوتوں کے شوقین ہیں۔

پہلے زمانے کی دعوتوں اور آج کی دعوتوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلے ناراضگیاں اور اس جدید دور میں حسد اور کینہ موضوعِ گفتگو ہیں۔ شوقین حضرات اپنا تعارف کرانے کے لئے دعوتیں کرتے ہیں اور مختلف جتن کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہم بھی پہچانے جائیں اور اہم لوگوں کو یہ پیغام پہنچے کہ ہم بھی آٹھویں جماعت پاس ہیں۔

سچ پوچھیں تو اس وقت کے سارے پڑھے لکھے لوگ پاگل اور نفسیاتی مریض پائے گئے ہیں۔ کوئی سمجھ والی بات تو اب بچارے ان پڑھ ہی کریں گے۔ ورنہ مال پر دھمالیں ڈلوانے والے شوقین تو بے خبری میں ان غسلخانوں میں چلے جاتے ہیں جہاں پانی تو دور ٹشو پیپر بھی نہیں۔ پھر سلام تو پڑوسیوں کو ہے جو بھاگ کر پرانی اخباریں لا کر دیتے ہیں۔ تو ایسی اور اتنی جلدی بھلا کس کام کی؟ ان کی بد بختی ثابت کرنے کے لیے انکے اپنے کردار ہی کافی ہیں جو بغیر سوچے سمجھے دوسروں سے دشمنی مول لے لیتے ہیں۔ یہی تو بڑا شر ہے، جو اس کو بے وقتی خواہشات کے قابو میں لا کر بغیر پانی کے غسل خانے میں لے جا کر اکیلا کر دیتا ہے۔ یہ اپنے آپ سے بڑی غداری ہے، جو حسد کی صورت میں تباہ کرتی جائے گی، یہاں تک کہ خود تو تباہ ہوگا ہی ہوگا لیکن اپنے ساتھیوں کو بھی لیکر جائے گا۔

آج والی نصیحت نے خالو کے ہوٹل کی چائے کا سارا نشہ ہی اتار دیا۔ خالو کے ہوٹل کے حالات دیکھو، گڑ بھی کیمیکل والا سفید، اس سے تو چینی بہتر تھی۔ ہمارے مہمان ٹھہرے شہد اور کالی بھینسوں کے خالص دودھ کی چائے پینے کے شوقین اور آج بغیر دودھ کی چائے پر صبر کریں۔ وہ مزہ بھی آج خراب ہو گیا۔

اعتدال ہی بہتر ہے

اگر قوت ہاضمہ ایک بڑی مقدار میں مختلف غذاؤں کو ایک ہی وقت ہضم کرنے کی طاقت رکھے تو پھر کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، اور کیوں کسی حکیم کا پوچھا جائے۔ جو آیا بسم اللہ! بچپن میں ایک شیدی اسکول میں آ کر کرتب دکھاتا تھا، شیشے، ٹائر، پتا نہیں کیا کیا کھا جاتا تھا۔ ایسے ہی بڑے دادا ابو کے دور میں ایک ملنگ فقیر آتا تھا جس کے سامنے بکرے کا کچا گوشت رکھا جاتا تو وہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھانا شروع کر دیتا تھا۔ ایسے مناظر خود ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں۔ پھر چاہے ہم انہیں جادو کہیں یا کوئی بھی نام دیں۔ اب کچھ ہی دن پہلے چچا او بھائے (فرضی نام) کی ساس فوت ہوئی۔ اصل میں چچا او بھایا دل میں بہت خوش ہوا ہوگا، لیکن گھر والی آنٹی چیڑا (فرضی نام) کے جوتوں کی وجہ سے آنکھوں میں لونگ کا پانی ڈال کر رونے کا ڈرامہ کرنے لگ جاتا تھا، اور آنٹی چیڑا دلاسہ دیکر چپ کرواتی تھیں اور کہنے لگتی تھیں کہ دل چھوٹا نہ کر میں جو بیٹھی ہوں۔ اندرونی طور پر چچا او بھایا یو بولتا ہوگا کہ نام تو تیرا تھا یہ بچاری خواہ مخواہ پہلے گئی۔ فاتحہ کی رسم ادا کرنے کے لیے تولو مولو (فرضی نام) والا سارا گروپ خانو کی رہنمائی میں ایک نئے دوست محبن مُردہ کے ساتھ وہاں جا کر پہنچا۔ فاتحہ کے بعد ختم کی روٹی کا پروگرام تھا۔ پڑوس والے مولوی یعقوب اور اس کے شاگردوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ ہوا ایسا کہ محبن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دستر خوان پر دھاوا بول دیا۔ چچا او بھایا شرم کے مارے چپ رہا۔ تولو مولو کی ہدایتوں پر پرانے دوستوں نے تو کچھ رحم کیا لیکن محبن نے تو مچھلی، فارمی مرغی، کسٹرڈ، میٹھے چاول، مولوی یعقوب والا دیسی مرغا، دہی کا ڈبہ، دودھ کا پیالا سب کچھ ختم کر دیا۔ پر جب خیر سے واپسی کا سفر شروع ہوا تو پیٹ میں ہیرا پھیری شروع ہوئی۔ تولو مولو ادیب خلیل عارف کھوسہ کا لکھا ہوا شعر پڑھ کر محبن کا مذاق اڑانے لگا۔

"روڈ کھا گئے، پتھر کھا گئے، کھا گئے سارے راستے"

اس پر تو ایسی ہلچل مچی جیسے بندے کے اندر نیب کی ٹیم آ اتری ہو۔ ایک طرف مچھلی تڑپ رہی ہے تو دوسری طرف مولوی یعقوب والا دیسی مرغا اور دودھ کا پیالہ، تکلیف میں پہلو بدلا تو کسٹرڈ کے ساتھ دہی، چاول، فارمی مرغی بھی حرکت میں آ گئے۔

خانو نے بیزار ہو کر حکیم اللہ رکھیو کے پاس پہنچایا۔ حکیم نے دیکھتے ہی خانو سے کان میں کہا کہ تیرا دوست تو کھانے کے معاملے میں کوئی کامریڈ ہے۔ ایسی بے عقلی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم نہیں سنا؟ ایک یہ کہ بھوک ابھی باقی ہو تو کھانا چھوڑ دو؟ اور دوسرا یہ کہ ہر بات میں میانہ روی اختیار کرو؟

قحطِ محبت

آ جکل کے اس نفسا نفسی کے دور میں اشیاء خورد و نوش کے قحط کے ساتھ ساتھ پیار محبت بھی مفقود ہے۔ معاشرے میں ہر طرف نفرتیں پھیلانے والے عناصر جگہ پا چکے ہیں۔ جس طرف نظر دوڑائیں مکاروں کا راج ملے گا۔ ذخیرہ اندوزی عام ہے۔ حرص اور ہوس پرستی ساری حدود پھلانگ چکی ہیں۔ اور معاشرہ انتہا تک پہنچ چکا ہے۔ انسان، انسان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں چاہے وہ خون کے رشتے میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہر طرف مفادات کی جنگ جاری ہے۔ دوستیاں یاریاں سب مقصد کی خاطر نبھائی جا رہی ہیں۔ جہاں ایک عزت دار انسان کو کسی چاپلوس پر فوقیت دی جائے، وہاں محبتوں کے پرچار کرنے والوں کے پاس سوائے امیدوں کے اور کیا ہو گا؟

تو لو مولو 'محبت کے دن' کا نام سن کر گلاب کے پھول لیکر نکلے۔ سوچ رہے تھے کس کو دیں۔ پھر ٹھنڈی سانس لیکر سوچنے لگے۔" ہم بیروزگاروں سے بھلا کون محبت کرے گا؟ یہاں تو ہر بات کی قیمت ہے۔ بغیر مطلب کے کوئی سلام بھی نہیں کرتا" ۔اسی سوچ میں تھے کہ لکھانو نے انکے ہاتھوں میں پھول دیکھے تو لپک کر آ گیا۔ اسے پھولوں کے ہار پہننے کا شوق رہا ہے۔ خوش ہو کر پوچھا،

"تم یہاں میرے لیے کھڑے ہو"؟

یہ تو شروع سے ہی جلے بیٹھے تھے۔ یکدم کہا،

"ہم اپنی منگیتروں کو دیں گے"۔

"جنہوں نے شادیاں کی ہیں پہلے ان سے تو پوچھیں۔ پھر کسی کو پھول دیں!" لکھانو نے جل کر کہا۔

چاچا چوکیدار لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا آیا اور بولا،

"مجھے آپ لوگوں کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ سوچا بچارے انجان ہیں کچھ سمجھا کر جاؤں۔ شائد کوئی فائدہ ہو"۔

"میرے بیٹو! اپنے گاؤں کے قریب خانو والے ہوٹل کے مشرق کی طرف جو مٹی والا بڑا ٹیلا دیکھ رہے ہو وہاں نمرو کے نام سے ایک شخص رہتا تھا۔ بڑا شوقین ہوتا تھا۔ شوق میں تین چار شادیاں کر لیں۔ کچھ وقت قصہ چلتا رہا جب تک طاقت تھی۔ لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، بس نہ پوچھو۔ سارا دن مویشی چراتا تھا جیسے ہی مغرب کے وقت گھر لوٹتا تھا تو جیسے کوئی کتا گھر میں داخل ہو گیا ہو۔ چیخیں شروع ہو جاتی تھیں۔ ہم خاموش، اپنے کانوں سے سنتے تھے۔ بالآخر بچارے نے چچا او بھائیو کے ابو کی اوطاق پر ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر عمر گذار کر پوری کی۔ وہ ٹیلا آج بھی گواہی دے رہا ہے، بس بچو کچھ خیال کرنا۔ وقت بڑا ہی تنگ ہے"۔

ڈار اور ڈالر

آج خالو والے ہوٹل پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹو بھی کبھی رو رہا تھا تو کبھی ہنس رہا تھا۔ سارے برتن الٹے پڑے تھے۔ بلیاں بھی ہونٹ چاٹ رہی تھیں۔ اتنے میں چچا چنبڑ (فرضی نام) کھٹی لسی کا جگ ہاتھ میں لیے درویش اور ایک انجان شخص کے ساتھ آکر بیٹھے۔ میزیں مٹی سے بھری ہوئی تھیں جیسے صدیوں سے اس ہوٹل نے کوئی گاہک نہ دیکھا ہو۔ وجہ؟ مہنگائی، چائے پتی اور چینی کی قلّت اور گاہک کی عدم موجودگی، اوپر سے خالو زمینداروں کے پیچھے اور زمیندار سیٹھوں کے عذاب کی وجہ سے بخار میں مبتلا۔ رات کی سیاہی میں رائی کا ریٹ گرا کر سٹاک کر لیتے ہیں پھر بلیک مارکیٹنگ کرتے ہیں،۔ ایسے ہی کئی لوگ روز مرہ استعمال کی چیزیں اسٹاک کرکے پھر بہت مہنگی بیچتے ہیں۔ بظاہر یہ سب اس دیس کے بڑے نیک نام بزرگ حضرات ہیں۔ جہاں بھی اچھائی کی کوئی بات چلے یہ سب سے آگے۔ مقدس مقامات اور عبادت گاہیں انکی آماجگاہیں ہیں۔ صدقہ خیرات دیتے ہیں۔ لنگر بانٹتے ہیں۔ غریب غربا تو بیچارا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ تو چند چمچے آٹا فقط نسوار کی طرح سونگھنے کے لیے اپنے بچوں کی ناک میں ڈال کر خوش ہوتا ہے لیکن یہ نیک مرد اپنے فرج بھرنے کے بعد اور پیٹ پھٹنے تک بھی خوش نہیں ہیں۔

ویسے ساری تبدیلیاں انہی کے فائدے میں جاتی ہیں۔ چیزیں مہنگی ہوں تب بھی فائدہ انکو۔ اگر سود کی شرح بڑھے تب بھی انکو فائدہ۔ عبادتوں کا فائدہ بھی انکو پھر آخرت اور جنت کا ذکر نکلے تب بھی فائدہ انکو۔ ہر طرف سے مکمل فٹ قرار پاتے ہیں۔ پر غریب کے کپڑے میلے کیونکہ پانی نہیں۔ سرف صابن مہنگا، استری اور بجلی جیسے ایک خوفناک خواب۔

پسینے والا جسم اچھی عبادتگاہوں کے لائق کیسے ہوگا جہاں عطر اور پرفیوم سے بھیگے نیک انسان اگلی صفوں میں کھڑے ہوں؟

پتا نہیں درویش کیا کیا کہتا جا رہا تھا۔ پھر اس شخص سے جب درویش یادداشتیں پوچھنے لگا، تو بوڑھے شخص نے کہا کہ مجھ کو سندھ میں تیس روپے والی گندم یاد ہے اور اس وقت بھارت میں دو سو روپے میں گندم ملتی تھی۔ ہم سن کر حیران ہوتے تھے کہ اتنی مہنگی گندم کیسے۔ آج ساڑھے چھ سو روپیہ من آٹا سن کر ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی خوفناک خواب میں سمندر کے کسی جزیرے میں ہوں۔ پہلے پیسے، پانچ پیسے، چار آنے اور آٹھ آنے چلتے تھے۔ روپیہ تو بعد میں دیکھا۔ کلو اور سوا کلو پر لڑائی ہوتی تھی۔ لیکن آج جہاں بیٹھتے ہیں لوگ "ڈار، ڈار" کہے جا رہے ہیں۔ سمجھ نہیں سکے۔ ہم ڈینگیں مارتے تھے کہ مرچی کی فصل اترنے پر ادھار واپس کردینگے۔ ایسی ڈینگیں آجکل کے لڑکے مارتے ہیں کہ ڈار ڈالر کو قید کردے گا اور ہم شادیاں کریں گے۔ اب پتا نہیں یہ ڈار کون ہے اور ڈالر کونسی بلا ہے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ڈالر کیا ہے۔ درہم اور ریال کا تو ضرور حاجیوں سے سنا تھا۔

ہمارے جھوٹے رسم و رواج

جس مرجھائے ہوئے معاشرے کا کپتان ہی جھوٹ ہو، اس میں دھوکہ اور فریب کے بغیر اگر کوئی شخص کامیاب ہونا چاہے تو وہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اب ہماری تربیت اور نشونما ہی اس بنیاد پر ہو رہی ہے جس میں ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ نقل کیسے کی جائے، ملاوٹ کیسے کی جائے۔ ٹھگی اور دھوکہ فریب کے نئے نئے روپ ہمیں سکھائے جاتے ہیں۔ کوئی بھی شعبہ ہو، ہر کام میرٹ کے بجائے رشوت سے ہوتا ہے۔

جہاں عزت کپڑوں اور ڈریسنگ کو ہو، شریف نفس انسان کی شریفانہ پوشاک ندامت کا باعث ہو۔ جہاں معاشرتی ٹھیکیدار مفادات اور ذاتیات کی بنیاد پر سارے فیصلے کرتے رہیں۔ جہاں نقل اصل پر ہر طرف سے حاوی نظر آئے۔ دیکھنے اور پرکھنے کے باوجود کوئی بھی سچ کہنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ دھرم اور مذہب فقط رواج اور رسم بن جائیں۔ انسان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جائے، پھر ایک کمپیوٹر کے تحت اس کو ایسے چلایا جائے جیسے والدین اپنے بچوں کو موبائل فون ہاتھوں میں دیکر پب جی گیم ڈاؤن لوڈ کرکے دیں اور دل میں کہیں کہ چلو شور کم ہوا۔ گاؤں کے والدین اپنے معصوم بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے گٹکے اپنے ہی کیبن سے اٹھا کر کھلائیں اور کہیں کہ بچہ اب پرسکون رہے گا، جہاں بڑی بڑی مہنگی گاڑیاں سود پر خرید کر عام عوام پر رعب قائم رکھنے کا رواج عام ہو، گھر میں کوئی برتن اپنا نہ ہو اور باہر ادہار لی ہوئی ڈبل کیبن پر دو تین بے روزگار باڈی گارڈ بٹھا کر رعب جھاڑنے کا رواج ہو، جہاں حق کی روزی کو ناقص سمجھ کر، حرام کو حلال اور منافع بخش کاروبار قرار دیکر اس سے کمائی ہوئی دولت سے مذہبی فریضہ ادا کرنا نیکی سمجھا جائے، جہاں معصوم بچوں کے ساتھ جنسی حیوانیت سرعام ظاہر ہونا شروع ہو جائے، ہم جنس پرستوں کو شغل کے طور پر سماج میں شامل کیا جائے، حلال نکاح بھی جہیز، گھر وغیرہ کی غلط فرمائش کی بھینٹ چڑھ جائے، پھر گٹر اور نالوں پر انسانی نسل کو جانوروں کی خوراک بنتے دیکھنے کے باوجود نہ کوئی خوف نہ کوئی رنج محسوس ہو، انسان جہاں کیک کاٹ کر لمبی خوشیوں والی عمر کی دعائیں مانگتا ہو اور والدین بچارے ناکارہ بن کر کسی کونے میں ریٹائرڈ افسر کی طرح ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہے ہوں، وہاں دھرتی کے اوپر زلزلے، انسانیت کا زوال لیکر نہ آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟

روایتی نیا سال

زندہ انسانوں کے لیے سال بدلتے رہتے ہیں۔ شغل کرنے والوں کے لیے مستیاں اور میخانے بہت۔ فکر کرنے والوں کے لیے فہم و فراست، غور و فکر اور گذرے ہوئے لمحوں پر اپنا احتساب کرنا اچھا ۔ اسی طرح، فضول، فالتو، کاہل اور فارغ لوگوں کے لیے ویرانیاں اور واہیات چراگاہیں بھی بہت ہیں۔ امیر و امرا کے لیے نئی پالیسیاں، حکمرانی کی چالیں، بازیگروں والی الٹی سیدھی مکر و فریب کی باتیں ہیں تو بے فکروں کے لیے غم نہ خوف، نہ طلوع کی خوشی نہ ہی غروب کا ڈر۔ ایسے میں گذرا ہوا وقت تو گزر گیا پر آنے والا کیسا ہوگا کوئی فکر نہیں۔

بہرحال آج جھونوں (بڑے بوڑھوں) کی مچ کچہری (آگ کے گرد محفل) کی دعوت قبول کی اور وہاں پہنچ گئے۔ لوگ آنا شروع ہوگئے۔ کسی کے ہاتھ میں کیک اور مٹھائی تو کسی کے ہاتھ میں کالا مرغا۔ او بھائے کے ہاتھ میں پکانے کے لیے لاہوری گاجر، رمو کی چھوٹی انگلی میں تھیلی مونگ پھلی کی۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ لے کر آ پہنچا۔ مچ جلانے والا شعبہ جانن جانی کا تھا اور لکڑیاں صوبے بے سُرتی نے لیکر آنی تھیں۔ گاجر پکانے کی ذمہ داری کالو کالے اور جمن جمالو کو ملی ہوئی تھی۔ مرغے کی سیخیں بنانے کا کام شانو شر میلے کے پاس تھا۔ بس ہر کوئی اپنے کام میں لگ گیا کہ خدمت میں برکت ہے۔

کاکا جھونا بار بار کہہ رہا تھا یہ جھونپڑی لنگر گاہ بھی ہے اور محفلِ محبت بھی۔ دنیا کے دکھی ساتھی اپنے دردوں سمیت یہاں چل کر آتے ہیں اور ماحول سے لطف اندوز ہونے کے بعد مزے سے گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی دل دکھانے والی

بات نہیں کی جاتی اور نہ ہی کوئی سیاسی اور مذہبی بحث وغیرہ۔ بس تاریخی باتیں اور عظیم انسانوں کی جدوجہد اور پرانی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ ہم بھی عادی ہو گئے تھے۔ وقت نکال کر جھونوں کے پاس پہنچنا ہی تھا۔

بازاروں، شہروں اور گلیوں میں آوازوں کی گونج تھی۔ کانٹے نے بارہ بجائے تو ہم گاجر اور مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ولو کے لڑکے نے اپنے دادا کی پرانی خراب دونالی بندوق میں ایک طرف بیٹری سیل اور ایک طرف جھونے کے صندوق سے چرائے ہوئے کارتوس اچانک فائر کیے اور جانو کیک کاٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ چاقو سے مرغے کی کھال اتار رہے تھے اس لیے کہ جانو گھاس کاٹنے والی درانتی سے کیک کاٹ رہا تھا۔ یوں نئے سال کے چکر میں آدھی رات ہو گئی۔ بھوک بھی بہت لگی تھی۔ گزشتہ روز قادن کے پوتے کے عقیقے سے بچے ہوئے میٹھے چاول پڑے ہوئے تھے ہم نے کھا لیے۔ نانو نوری کی اونٹنی کا دودھ دیکھا تو اوپر سے دو تین گلاس پی لیے اور زیادہ انتظار کیے بغیر گھر کی طرف چل پڑے۔

روزنامہ "انکوائری" ہفتہ 31 دسمبر 2022ء۔

روزنامہ "پاسبان" ہفتہ 31 دسمبر 2022ء۔

روزنامہ "نباہ" ہفتہ 31 دسمبر 2022ء۔

روزنامہ "سرمایہ" ہفتہ 31 دسمبر 2022ء۔

حرص والے ہارتے ہیں

کائنات کے مالک نے زندگی میں جہاں خیر رکھی ہے وہیں شر بھی رکھا ہے۔ رات اور دن اور نیکی بدی کے جوڑے بھی رکھے ہیں۔ جہاں گرمی کے جھٹکے ہیں وہیں سردی کی ٹھنڈک بھی سکون دیتی ہے۔ ایسے ہی ہار اور جیت بھی ایک قسم کے تحفے ہیں۔ چاہے وہ کھیل کے میدان میں ہوں یا سیاست میں، یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں۔ تخت اور عزت ہمیشہ نہیں رہتے۔ جس تخت پر یزید جلوہ گر ہوا تھا اس ہی تخت پر عمر بن عبدالعزیز جیسا نیک مرد بھی تشریف فرما ہوا تھا۔ اب یہ تاریخ بتاتی ہے کہ کون حق پر تھا اور کون جھوٹا تھا۔ کچھ باتیں دنیا کی چمک میں اور وقت کے تغیرات میں ضرور گم ہو جاتی ہیں، کچھ مفادات کی نظر بھی ہو جاتی ہیں۔ یقیناً انسان اپنی خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے، یا اس کو مجبور کیا جاتا ہے لیکن سویا ہوا ضمیر جاگ بھی جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظاہر میں خاموش ہو جائے یا خاموش کروا دیا جائے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ کشتی کے مقابلے میں وقت کے ایک بڑے پہلوان، جس پر لوگوں نے بڑی بڑی شرطیں لگا رکھی تھیں، سے کشتی لڑنے ایک کمزور جسم والا جوان میدان میں اُترا۔ سارے تماشائی حیران و پریشان تھے کہ ایک مانے ہوئے پہلوان کے سامنے یہ کیوں ہڈیاں تڑوانے کے لئے آیا ہے۔ لیکن اس کمزور جسم والے نے ایک لفظ اس پہلوان کے کان میں بولا اور پھر سب نے دیکھا کہ کمزور جسم رکھنے والے نے کشتی جیتی اور انعام لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ بڑا پہلوان تماشائیوں کے طعنے، طنز، گالی گلوچ گردن جھکا کر سنتا رہا۔ لیکن وقت نے تسلیم کیا کہ وہ ہارا ہوا شخص

وقت کے صوفیاء کرام کا امام جنید بغدادی رح کے نام سے ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔ جیتنے والا غائب ہو گیا۔ لیکن جن الفاظ نے جتوایا اور ہرایا ان میں سوز اور وفا کے عناصر شامل تھے۔ پھر تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ ایک لشکر کا سپہ سالار کالی رات میں امام حسین علیہ السلام کا راستہ روکنے کے لئے آتا ہے، لیکن وہ حر کا لقب پا کر ہمیشہ تاریخ میں رقم ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو ایک بڑے لشکر کے ہاتھوں شہادت ملی ہے لیکن اس کی مقبولیت کے پیچھے وفا کا عنصر ہے۔ تاریخ میں ٹیپو سلطان کا نام بھی ابھی تک بطور شہید گونج رہا ہے لیکن جعفر اور صادق کو غدار کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھار ہار ایسے رنگ چھوڑ جاتی ہے، جو آنے والے دنوں میں جیت کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور جیتنے والے کی خوشیاں اس ہار کے پیچھے چھپ کر گم ہو جاتی ہیں۔ آج بھی ان جوانوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے جنھوں نے مفادات سے ہٹ کر زندگی کی جنگ ہار دی۔ لیکن دنیاوی جنگ ہارنے کے بعد بھی مقبولیت کی معراج حاصل کر کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں۔ ہم چاہے کتنے ہی خود غرض اور مفاد پرست ہو جائیں لیکن تاریخ کو چھپا نہیں سکتے۔

روزنامہ "آزاد ریاست" اتوار 24 اپریل 2022۔

توانائی کا تاوان

قدرتی وسائل، جیسے مختلف اقسام کی گیس اور تیل، کے ذخائر پر کنٹرول حاصل کرنے کی دوڑ ہی بین الاقوامی جھگڑوں اور جنگوں کی اصل وجہ ہے، اس وقت دنیا کی نظریں خاص طور پر سپر پاور ممالک کی نظریں ان ملکوں پر اٹکی ہوئی ہیں جہاں ایسے ذخائر موجود ہیں کیونکہ یہ اب انسان کی مجبوری بن چکے ہیں۔

پانی بھی ایک بڑا اشو رہا ہے، بستیاں ہمیشہ سمندر اور دریا کے آس پاس آباد کی جاتی رہی ہیں۔ پہلے زمانے سے لے کر اب تک آمد و رفت اور کاروبار سمندر کے ذریعے ہوتے رہے ہیں۔ دریا زراعت اور بجلی کے لیے ڈیموں کی صورت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن ملکوں نے ان توانائیوں کی پیداوار میں ترقی حاصل کی وہ ترقی پا کر طاقتور ہو گئے ہیں، اور دوسرے ممالک کے ذخیروں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض رہتے آ رہے ہیں۔ پھر وہ قابض ممالک ان ممالک کو انہی کے ذخائر کی پیداوار تاوان لیکر واپس لوٹاتے ہیں. اپنے وسائل پر خود تاوان دینا پڑتا ہے۔

سودی قرضہ جات نے بھی غریب ملکوں کو ٹی بی کے مرض کی طرح جکڑ لیا ہے، ٹی بی کا پھر بھی علاج نکل آیا ہے۔ مگر ان سود خوروں کا قرض کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ ایسا حشر ایک زہریلے مافیا کی صورت میں کیا جا رہا ہے جس کی جکڑ میں کافی مسلمان ملک آ چکے ہیں۔

بجلی کی پیداوار پر پیٹرول بم گرایا گیا ہے۔ اس کا اثر صنعتی اداروں سے ہوتے ہوئے عام آدمی پر سیدھا اثر انداز ہو رہا ہے۔ بجلی کی فی یونٹ کے حساب سے بڑھتے ریٹ نے کمر ٹیڑھی ہی نہیں کی بلکہ توڑ کر رکھ دی ہے۔ اوپر سے نہر کے آخری علاقوں تک پانی کی دستیابی دن بہ دن کم ہو رہی ہے۔ ان سب کا حل احتجاج نہیں ہے بلکہ کوئی مکمل، وسیع اور

محنت طلب عمل ہے جس میں ایک عام آدمی سے لے کر اقتدار کے اعلیٰ کرداروں تک کو شامل ہونا چاہیے۔اس میں سب سے بڑی بات دل و جان اور ایمانداری سے کوشش کرنا ہے۔

شمسی توانائی بجلی کے نعم البدل کے طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ اس کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے کوششیں کی جائیں۔ کھانا پکانے کے تیل کی فصل کے لیے کاشتکاروں کو حوصلہ دے کر انکی مالی اعانت کی جائے۔آبی ذخائر کو محفوظ کرنے کے لیے جامع حکمت عملی بنائی جائے۔ حکومتی سطح سے لے کر ایک عام آدمی تک کو برساتی پانی جمع کرنے کی ترغیب دی جائے ور مدد کرنے والے حوصلہ افزا اکام کیے جائیں۔ سود کی دلدل سے نکلنے کے لیے ٹیکنکل چور مافیاز کا صفایا کر کے جان چھڑائی جائے۔آنے والی نسل کے لیے کچھ قربانیاں دی جائیں اور کچھ کو قربان کیا جائے تاکہ غربت اور مفلسی کا خاتمہ ہوسکے اور احساسِ محرومی کا شکار معاشرہ اپنے آپ کو اس سارے نظام کا حصہ دار سمجھ کر ہاتھ بٹاسکے۔

روزنامہ "پروان" منگل 7 جون 2022۔

سفر میں ہی تو منزل ہے

سفرِ انسانیت، بابا آدم علیہ السلام کے وجود سے شروع ہوتا ہے، اور منزل پھر گندم والے ارتکاب گناہ کے بعد وجود میں آنے لگتی ہے۔ اگر انسان، انسانی جسم سے نمودار نہ ہوتا تو ایک شیطان صفت فرشتہ شیطنت نہ کرتا۔ انسان کا مقصد انسانیت کی طرف سفر ہے. ایک انسان جب انسانیت کی طرف سفر کی شروعات کرتا ہے تو دوسری طرف شیطان شیطنیت کے پھیلاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتا ہے۔

سفر، سفر ہی رہتا ہے اور منزل کی تلاش ہمیشہ سفر ہی میں ممکن ہے۔ ابد سے ازل تک چلنا ہے۔ ایسے ہی زندگی کا سفر ماں کی گود سے قبر کی کالی رات تک ہے۔بیچ والی مدت یا مہلت ،جوانی والے دن اور مست راتیں، جاگنے یا سونے میں گزریں گی۔ یعنی یہ بھی ایک سفر ہی ہے جو گزرنا ہی ہے۔ سفر تو منزل پر پہنچ کر ہی ختم ہوتا ہے۔ ایسے ہی زندہ انسان کا زندگی میں سفر ہے۔ کنوارے پن سے ازدواجی زندگی کی طرف سفر ،اپنے شریک حیات سے جڑنا، آزاد پنچھی کا ذمہ داریوں میں بندھ جانا، ایک بیروزگار کا روزگار یا نوکری میں آنا اور فرائض انجام دینا (اور محسوس کرنا کہ نوکری تو ٹوکری ہے!) ، وقت کے قائدے قانون کو سمجھنا اور پابندی کا احساس پیدا ہونا۔ایسے ہی ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر۔ پہلے زمانے میں سفر پیادہ یا اونٹوں اور گھوڑوں پر ہوتا تھا اب گاڑیوں اور جہاز وغیرہ پر، لیکن سفر تو پھر بھی سفر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے ایک تو آب وہوا تبدیل ہوتی ہے اور دوسرا مختلف جگہوں پر جانا فائدہ مند ہوتا ہے۔ پھر وہ چاہے کاروباری ہو، ثقافتی یا سیر و تفریح کا ہو مگر ماحول اور ذہن تبدیلی ضرور محسوس کرتا ہے۔

ستارہ شناس کہتے ہیں کہ سفر کرنے سے ستارے تبدیل ہوتے ہیں اور گردش میں ستارے جگہ تبدیل کرتے ہیں اور زندگی کے حساب کتاب میں نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اگر سفر اکٹھے اور قافلے کی شکل میں فیملی اور دوستوں کے ساتھ ہے تو ایک دوسرے کو سمجھنے کا سبب بنتا ہے۔ اور یقیناً سفر کے دوران کے واقعات، تکلیفیں اور تھکاوٹیں ہمیشہ یاد رکھی جاتی ہیں۔ پھر اپنی اگلی نسل کو سنائی جاتی ہیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا ہے،

پیرین پنڈ گندیاس

گوڈن پر گِسکندیاس

یعنی پیروں پر پورا پورا زور دوں گی۔ اگر پیروں نے چلنا چھوڑا تو گھٹنوں کے بل بھی چلوں گی۔

مطلب یہ کہ سفر چھوڑنا نہیں ہے۔ اگر سفر منقطع ہوا تو پھر منزل تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ سینے کے بل بھی سرکنے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر سینے کا ساتھ نہیں رہا تو کہنیوں پر زور دیا جائے گا۔ ماتھے اور سر کو بھی استعمال کیا جائے گا مگر ہار تسلیم نہیں کی جائے گی۔ اگر منزل نہیں ملی تو بھی سفر میں ہی جان جائے گی مگر پیچھے نہیں ہٹا جائے گا۔ مایوس نہیں ہونا۔

یہی تو سبب ہے کہ سائنسدانوں نے کسی میدان میں تحقیقات جاری رکھیں تو منزلیں حاصل کیں۔ دنیا والے رسہ کشی کرکے اقتدار سے ہمکنار ہوئے۔ کاروباری حضرات کاروبار میں، روحانی لوگ روحانیت میں کامیاب ہوئے۔ گویا بغیر جدوجہد کے سفر کی دشواریاں اور اذیتیں سمیٹے منزل کو پانا ممکن نہیں۔ بس سارہ نچوڑ ہی سفر ہے۔ سفر آزمائش اور کامیابی کے بیچ کا راستہ ہے۔ اگر گھر بیٹھے ثواب زیادہ ملتا تو مسجد کی طرف جانے کی ترغیب نہ ہوتی۔ ایسے ہی زندگی بھی اک سفر ہے، پیدائش سے موت کی آغوش تک۔ سب سفروں کو اچھا بنانے والا ہتھیار کردار ہے۔ اگر وہ ہے تو سفر کے ساتھی بھی مطمئن ہونگے۔ سفر میں آپکی دوستیاں اور یاریاں بڑھیں گی۔ ایک دوسرے کی اخلاقی خوبیاں نظر آئیں گی اور معاشرہ اچھائی کی طرف بڑھے گا۔ سفر ایک تربیت اور ترتیب کا سبب بنتا ہے۔ گھر میں انسان وقت کی قدر نہیں کرتا مگر سفر میں قدر کرنا پڑتی ہے ورنہ سواری اور ساتھی نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ پھر ثواب اور گناہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کے بعد بھی ایک فکر رہتی ہے کہ آخری سفر میں کس کا ساتھ زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ پھر زندگی کے آخری سفر کی تھکاوٹ یعنی بڑھاپے میں یا آزمائش میں اگر پچھتاوا آنے لگے تو سمجھو کامیابی آپکو ڈھونڈ رہی ہے۔ اب شاید تم اپنی گمشدہ چیز کو حاصل بھی کرلو۔

درویش سائیں کی باتیں سننے کے بعد یقین ہو گیا کہ منزل پر پہنچنے کے لیے سفر لازمی ہے۔ تب درویش سے اجازت لی اور دوسرے دن پھر رومی کی بیٹھک میں حاضری دینے کا شوق لے کر چل پڑے۔

"کمال نیوز" بدھ 13 اکتوبر 2021۔

دنیادار انسان کی داستان صوفیت کی آنکھ سے

دوستو! مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ انسانیت کیا ہے۔ میں لاعلم تھا۔ دین اور مذہب میرے لیے ایک رسم کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ میں دنیا کی بھاگ دوڑ میں اتنا آگے نکل چکا تھا جس سے واپس پلٹنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ یہ دنیا ہے جس میں تخلیق کار (اللہ تعالیٰ) نے اپنی تخلیقِ یعنی انسان میں نفس کو رکھ کر اس کو اشرف المخلوقات کا خطاب دے دیا۔ لازماً جس کو خطابات نصیب ہوتے ہیں، ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ ملتے ہیں، اس کے امتحانات اور پیپر بھی ہوتے ہیں۔ پر تیاری بھی کروائی جاتی ہے۔ انعامات بھی بڑے رکھے گئے ہیں تو سزائیں بھی۔ مگر معافی تلافی کی امیدیں اور ان تک پہنچنے کے راستے بھی دکھا دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی ناامید اور مایوس ہو جائے تو وہ اس کا نصیب، ورنہ راہیں بتلائی گئی ہیں۔ سوا لاکھ انبیاء کرام اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو اصلاح کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کسی بھی صوفی بزرگ نے کبھی بھی انسان کی ہدایت کے بدلے میں دنیاوی خواہشات کا اظہار نہیں کیا ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے روپ میں نام نہاد لالچی، حاسد اور دنیا کے بھوکے لوگوں نے اپنی آماج گاہیں سجا کر، انسانیت کے ساتھ غلط برتاؤ کرکے، ان صوفیاء کرام کے ناموں کو بدنام کیا ہے۔۔ جیسے آجکل ہر کوئی کسی خواب کے ذریعے کوئی مزار یا درگاہ بنا کر متولی یا پیر بن کر بیٹھ جاتا ہے، پھر اپنا کاروبار شروع کر دیتا ہے۔ اس قصور میں عوام الناس بھی برابر کے شریک ہیں کیونکہ انہوں نے روحانیت اور اصلاح کو فقط دعاؤں، دھاگوں، عملیات اور نمود و نمائش میں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ناامید ہو کر گلہ شکوہ کرنا شروع کر دیا۔

صوفیاء کرام کا پیغام ایسا ہرگز نہیں ہے، ان کا پیغام اللہ تعالیٰ کے طرف انسانوں کو متوجہ کرنا اور ہر شعبے میں آسمانی تعلیمات کے عین مطابق اصلاح کرنا ہے جو سارے

معاشرے کے لئے کارآمد ثابت ہوں۔ ان کو باور کروانا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور ہے، وہ معاف کرنے والا ہے۔آپ کے پاس کامیابی کا راستہ موجود ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں، غلط راستوں پر نہ چلیں، جن میں منشیات سے لیکر حیوانات اور انسان کی جان لینے تک کے خطرناک راستے شامل ہیں۔ ان کو چھوڑ کر اللہ پاک کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف آئیں۔سب سے پہلے ان پر درود پاک کی کثرت کریں۔ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کریں۔ان کی محبتیں حاصل کریں۔پھر ساری زندگی تبدیل ہو جائے گی۔طبیعت میں یک سوئی پیدا ہو جائے گی۔سکون اور خوشی محسوس ہونے لگے گی۔اپنے پرائے کی پہچان ہو گی۔خوامخواہ فریب اور دھوکے بازی کی عادتیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر آپ کے ہاتھ پاؤں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔انشاء اللہ تعالیٰ۔

اللہ ہم سب کا حامی اور ناصر ہو۔آمین۔

روزنامہ "پروان" جمعرات 26 نومبر 2020۔

روزنامہ "نوائے انصاف" جمعرات 26 نومبر 2020۔

روزنامہ "پیش رفت" جمعرات 26 نومبر 2020۔

ایک شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے

قتل تو قتل ہے، چاہے وہ کسی فرد کا جسمانی قتل ہو یا علمی، عقلی یا معاشی قتل ہو۔ پورا معاشرہ اس کا شکار ہوتا ہے۔ان سفاکانہ قتلوں کے پیچھے ایک وحشیانہ پن ملوث ہے جسے جدید زبان میں انتہا پسندی کہا جاتا ہے۔ وہ انتہا پسندی جدت اختیار کرکے ایک نیا روپ لے چکی ہے۔آپ اسے شیطانی قوتیں بھی کہہ سکتے ہیں جو افراد سے نکل کر معاشرے کے ہر پہلو میں اور تمام شعبہ جات میں پھیل گئی ہیں۔انتہا پسندی ایک نشے میں دھت ہاتھی کی طرح ہے، جو اپنی ہی اولاد کو کچل سکتی ہے۔ وہ کسی بھی رشتے کو نہیں دیکھتی۔ اس کا واحد مقصد معاشرے میں خون کی ہولی کھیلنا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض شکاری لوگ معصوم پرندوں اور خوبصورت جانوروں تک کو بغیر کسی مقصد کے صرف اپنے شوق کی خاطر وحشت کا نشانہ بناتے ہیں۔ حالانکہ، چرند پرند کی خوبصورتی انکی ہی نہیں بلکہ کل عالم حیوانات، انسانی معاشرے اور فطرت کی خوبصورتی ہیں۔ لیکن وحشی انسان یہ بھی نہیں دیکھتا کہ یہ نر ہے یا مادہ؟ ان کے پیچھے ان کے بچے تو نہیں؟ بس ایک مستی میں، صرف اپنی فضول خواہشات کی خاطر وہ ایسا کرتا ہے اور پورا معاشرہ اس کی قیمت ادا کرتا ہے۔

اسی طرح معاشرے میں موجود یہ بھیڑیے، نوعمر لڑکیوں کو نشانہ بناتے ہیں اور ان کے والدین کی زندگی مشکل میں ڈال دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک نئی انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔

اسی طرح بعض قبائلی رسم و رواج ایسے قاتل اور خطرناک ہتھکنڈے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ ان کے نقصانات اتنے بھیانک اور کبھی نہ مٹنے والے نشانات چھوڑتے ہیں جو تاریخ میں تو رقم ہو جاتے ہیں لیکن ان کا جرمانہ معاشرے کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

درویش کی باتیں من کو جھنجھوڑ رہی تھیں، جو کسی افطاری سے لوٹنے کے بعد بچا ہوا سامان محض انسانیت کی خاطر خالو کے ہوٹل پر ایک تھیلی میں لایا تھا کہ شاید کوئی بھوکا ملے تو اس کو کھلائیں۔ خالو، جس کو مہنگائی کی وجہ سے گھر والوں نے بھی آوارہ کتے کی طرح گھر سے نکال دیا تھا چائے کے ساتھ تھیلی میں بچا ہوا سامان کھانے لگا۔ پیچھے سے چھوٹے نے چلا کر کہا، " تھوڑا میری طرف بھی دیکھ لو"۔ تب خالو نے ہاتھ کچھ ہلکا کیا۔

درویش پھر اس عاقل پروفیسر کے اذیت ناک قتل پر روتا رہا جو آسائشیں ہوتے ہوئے بھی اس مقصد کے لیے نکل پڑا تھا کہ ستم گری میں پسے ہوئے معاشرے کے نچلے طبقے کو تعلیم کے میدان میں کچھ فائدہ دے سکے اور معاشرہ سدھر جائے۔ مگر خود اسی طبقے کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا۔ ایک استاد کا قتل پورے معاشرے کا خوفناک قتل ہے۔

کس سے شکوہ کریں؟ یہاں کتنے ہی پڑھے لکھے بھی اس وحشی پن میں پھنسے ہوئے دیکھے ہیں۔ اب تو یہ وحشی پن ہر شعبے میں بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ سب کو ختم کرتا جا رہا ہے۔ جس طرح آجکل اس نے منشیات کے روپ میں گلی گلی اور شہر شہر کو جکڑ لیا ہے پتا نہیں انجام کیا ہوگا؟ ذخیرہ اندوزی سے لیکر ہر طرح کی برائی جڑ پکڑ چکی ہے۔ نتیجہ سب کو بھگتنا ہے۔ بھگت بھی رہے ہیں۔ اور اب کہنے کو کیا بچا ہے؟

روزنامہ "پروان" منگل 11 اپریل 2023۔
روزنامہ "سرمایہ" منگل 11 اپریل 2023۔
روزنامہ "پاسبان" منگل 11 اپریل 2023۔
روزنامہ "انکوائری" منگل 11 اپریل 2023۔
روزنامہ "احکام" جمعرات 13 اپریل 2023۔

سید غلام حیدر شاہ قلندری کی

شایع شدہ کتاب	شایع ہونے والی کتاب
1. منهنجا سهڻا سجڻ (ڪافيون)	1. ميدانِ عشق (تقريرون)
2. پلي چريو چون ماڻهو	2. وارداتِ عشق (تقريرون)
3. نرتئن منجهان نينهن	3. باغِ وفا جون رمزون (روحاني ڪچهريون)
4. هو جي هليا هنگلور (نثر)	4. لفظن جو جار (شاعري)
5. گونجيا گيت حيدر جا (شاعري)	5. انعامِ عشق (سوالن جا جواب)
6. آثارِ قيامت	6. بے سمجھی کی باتیں (اردو شاعری)
7. آذانِ عشق (تقريرون)	7. چوڏهينءَ وارو چنڊ (ڏاڏا سائين يوسف شاهہ رح جي سوانح حيات)
8. چنڊ چهرو محبوب جو (شاعري)	8. جهونن جي جهوپڙي (اصلاحي ڪالم)
9. پرينءَ جي پار جون ڳالهيون.	9. جوان جذبن ۾ پوڙهي وقت جي ڪڙي (اصلاحي ڪالم)
10. سجڻ جن کي سڏيو	10. خير خواهيءَ جي خيرات (ڪالم)
11. اعلانِ عشق (تقريرون).	11. دَٻي ۾ ٽڪريون (ڪالم)
12. انتقالِ عشق وصالِ يار (شاعري).	12. لڪيرن جا ليک (ڪالم)
13. نچوڙيو نينهن جن کي	13. ڪلي ڪچهري (ڪالم)
14. ہدایت نامہ سلوکِ قلندری	14. لوازماتِ عشق
15. وفاءِ محمد ﷺ	15. فلسفہ حسینیت
16. رڳون ٿيون رباب (الله پاڪ جو ذڪر ۽ ان جو نعمتون)	16. جهنگل ۾ جهرمٽ
17. منيون پيڙي پچ (اصلاحي ڪالم)	17. ڪچي ڪاچوٽي (ڪالم)
18. سفرِ عشق (ذکر اہل بیت اور زیارات مقدسہ)	18. وقت وارن جا ورق (ڪچهريون)
19. مقامِ محبت (عشقِ رسول ﷺ کے پروگرام، ربیع الاول 2021 کی محافل میلاد مصطفیٰ ﷺ)	19. لطيفي للڪار (ڪالم)
20. Salient Message of Sufism	
21. ٺهڪن ۾ ٺاڪوڙو (اصلاحي ڪالم)	
22. رازِ عشق	
23. The Vision of Life	
24. روميءَ جي اوطاق	
25. اسباقِ عشق	
26. ورتمر پر پٽائيءَ جي (ڪالم)	
27. سب چلتا ہے	